خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدّیقی

۲۸ر جنوری ۱۹۷۲ء - ۴ر جنوری ۱۹۷۳ء

قیمت : ———— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ——— ایک روپیہ

جلد:- ۳ شمارہ:- ۳۳

ادارئیے

یہ کیا ہو رہا ہے؟

و— پنجاب کی گلیوں میں خون بہہ رہا ہے -
و— کراچی میں مزدوروں کی چھانٹی اور برطرفیاں شروع ہوگئی ہیں -
و— مودودی ، اصغر خاں ، نصراللہ اور رجعت پسند جمہوریت کے چیمپئن بننے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں -
و— پیپلز پارٹی غلطی پر غلطی کر رہی ہے اور دوستوں کو دشمن بنانے کے عمل کو تیز کر کے عوام میں اپنا اثر و رسوخ ختم کرنے کے درپے ہے -

پیپلز پارٹی تمام صورتِ حال کی ذمہ دار ہے - سرحد سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مہم جس تیزی میں شروع کی گئی، اس کا ردِّ عمل اتنی ہی شدت سے پنجاب میں ہونا تھا - ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے پیپلز پارٹی پر لازم تھا کہ وہ پنجاب کے جذبات اور احساسات کا احترام کرتی - جنگی قیدیوں کی اکثریت یعنی ۹۸ فیصد کا تعلق پنجاب سے ہے - جنگ میں سب سے زیادہ نقصان پنجاب کو پہنچا ہے - یہ نقصان سرحدوں پر بسنے والوں کی تباہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں پنجاب کے مزدوروں اور کسانوں کے وہ سپوت، بہادر اور شیر دل فوجی شامل ہیں جنہوں نے بھارتی توسیع پسندوں کے مقابلے میں اپنی جانیں قربان کیں - یہ درست ہے کہ اس جنگ کا مقصد پاکستان کے حق میں نہ تھا لیکن اس میں ان فوجیوں کا کیا قصور ہے، جو اس نظام کے تحت حکم ماننے کے پابند ہیں اور جن کی تمام تربیت کا مرکزی نکتہ یہی ہوتا ہے -

پنجاب کا ہر گھر ان زخموں سے چور چور ہے - مائیں بیٹیوں کی راہ تکتے تکتے آنکھوں کے نور سے محروم ہو چکی ہیں - بہنوں کی آنکھیں بھائیوں کے انتظار میں پتھرا چکی ہیں - ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے -

اس عالم میں مصطفیٰ کھر کی گونج سنائی دیتی ہے کہ بنگلہ دیش کی مخالفت کرنے والوں کو کچل دیں گے - کوئی وزیر کہتا ہے کہ ٹانگیں توڑ دیں گے - کہیں سے آواز آتی ہے، موت کا راستہ منتخب

خاص مضامین

فون:- ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح - ۸۷ ڈی، ترسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے ش

الفتح

کیا گیا ہے تو ہمیں یہ منظور ہے۔

یہ دھمکیاں زخمی پنجاب کو وہ پارٹی دے رہی ہے، جسے پنجاب نے اپنی گود میں پالا۔ پروان چڑھایا اور جس کے لئے پنجاب نے ہر قسم کی قربانی دی۔ اِسے کون جھٹلا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی طاقت کا سرچشمہ پنجاب کے مزدور اور کسان نہیں تھے۔

پیپلز پارٹی نے ان زخموں کو بھرنے کی بجائے نمک پاشی کی۔ مودودی، اصغر خان اور نصر اللہ موقع پرستی کے یہ انمٹ شاہکار ہیں۔ اپنے بلوں سے باہر نکلے اور عوام کی قیادت کے علمبردار بن گئے۔ اصغر خان، بنگلہ دیش کے حامی ہی نہیں بلکہ مجیب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں ریکارڈ گواہ ہے۔ مودودی اور نصر اللہ بنگلہ دیش کے قیام کے ذمہ دار ہیں مگر پیپلز پارٹی کی غلط پالیسیوں نے ان مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے اور اب وہ جمہوریت کے چیمپئن بن رہے ہیں۔ عوام کو ان سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

ایک طرف پنجاب کا یہ حال ہے، دوسری طرف سندھ میں پھر مزدوروں کو اشتعالی بارود کی بھینٹ چڑھانے کی پالیسی پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ لانڈھی میں بھاری پیمانے پر چھانٹیاں ہو رہی ہیں۔ اب تک پانچ ہزار مزدور نکالے جا چکے ہیں، ولیکا کے دس مزدور رہنماؤں کو سبکدوش ہونے کی اطلاع ملی ہے۔

یہ کیا ہے؟، مزدوروں میں بے چینی کیوں پھیلائی جا رہی ہے کہیں پیپلز پارٹی میں اصغر خان، مودودی اور رجعت پسندوں کے ایجنٹوں نے اپنے دوسرے آقا کو منتخب تو نہیں کر لیا۔ اب وہ بھٹو صاحب کی بجائے اصغر خان کی کابینہ میں وزارتوں کو پکّا تو نہیں کر رہے۔

یہ لوگ ایوب خان کے ساتھ تھے۔ کالا باغ کے مخبر تھے۔ یحییٰ کے ایلچی رہے۔ بھٹو صاحب کے صفِ اوّل کے وزیرانِ با تدبیر ہیں۔

یہ کل بھی عوام دشمن تھے۔ آج بھی عوام دشمن ہیں۔ آئندہ کل بڑے عوام دشمن ثابت ہوں گے۔

عوام کو اپنا ملک بچانے کے لئے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سیاسی کارکنوں کو عوام سے گہرا رشتہ اور رابطہ قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

عوام کو اصغر خان، مودودی اور رجعت پسندوں سے خبردار کرو۔

پیپلز پارٹی کی غلط پالیسیوں پر عوام میں عام بحث کرو۔

تشدد کا جواب تنظیم اور صرف تنظیم ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی ہی ان سے نمٹ سکتی ہے اپنی پارٹی کو مضبوط کرو، اپنی سیاست سے عوام کو روشناس کراؤ۔

عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔

عوامی جمہوری انقلاب ہی سے نیا پاکستان تعمیر ہوگا۔

انتقامی کارروائی

ٹریڈ یونینوں کے عہدیداروں کی ملازمت کے تحفظ کے صدارتی آرڈی ننس کی موجودگی، اور مرکزی وزیر محنت کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ مزدور قوانین کی خلاف ورزی پر سخت سزا دی جائے گی، حکومت مزدوروں کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی برداشت نہیں کرے گی، اس کے باوجود کراچی میں وسیع پیمانے پر مزدوروں کے خلاف انتقامی کارروائیوں اور برطرفیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ لانڈھی میں تقریباً ۵ ہزار مزدوروں کو گیٹ اسٹاپ کر دیا گیا ہے۔ چار دن پیشتر ولیکا ملز کی یونین کے ایسے دس عہدے داروں کو برطرف کر دیا گیا ہے جو جیل میں ہیں یا ان کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ شالیمار ٹیکسٹائل ملز کی یونین کے تمام عہدے داروں پر روزگار کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ بعض مالکان نے ایسے مزدوروں کو بھی اظہارِ وجوہ کے نوٹس جاری کئے ہیں جو اس وقت پابند سلاسل ہیں۔ اور جیل میں بھی انہیں برطرفی کے خط دیئے جا رہے ہیں۔ ملوں میں انتظامیہ کے غنڈوں کا راج ہے۔ اور کراچی کے صنعتی علاقے پولیس اسٹیٹ میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

یہ صورتِ حال مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر رہی ہے۔ اور انہیں یقین کامل ہوتا جا رہا ہے کہ پیپلز پارٹی ملز مالکان کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ایک سالہ دورِ حکومت میں ملز مالکان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ان کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت اگر واقعی محنت کش عوام کی فلاح و بہبود چاہتی ہے اور خوشحال معاشرہ کا قیام چاہتی ہے تو وہ اپنے منشور پر عمل کرے۔

پنجاب میں لہو کا چھٹا دریا

پنجاب کی ہر تحریک کو
کچلنے کے لئے طاقت اور
تشدد کا استعمال کیا گیا

پنجاب، نواب کالاباغ سے مصطفیٰ کھر تک

واقفیتِ حال

بات بنگلہ دیش کے مسئلہ پر شروع ہوئی۔ "بنگلہ دیش منظور" "بنگلہ دیش نامنظور" کے نعرے پنجاب میں گونجنے لگے لیکن جلد ہی "بنگلہ دیش نامنظور" کے نعرے گرجتی ہوئی بندقوں اور آنسو گیس کے گولوں تلے دب گئے، لاہور کے وکلاء اور طلبہ کے زخموں سے بہنے والے لہو نے پانچ دریاؤں کی دھرتی کو رنگین کر دیا۔ آخر کار خواجہ رفیق کا خون بھی لہو کے چھٹے دریا میں شامل ہو گیا۔

خواجہ رفیق کا قتل، سیاسی قتل ہے؟ لیکن قاتل کا نشانہ خواجہ رفیق نہیں تھے، کوئی اور بھی اس کی گولی کی زد میں آسکتا تھا، قاتل نے تشدد کی سیاست کی حکمتِ عملی کے تحت گولی چلائی تھی۔ یہ گولی اصغر خان کو بھی لگ سکتی تھی یا کسی اور سیاست دان اور کارکن کو بھی، خواجہ رفیق کا قاتل وہ شخص نہیں جس نے گولی چلائی، بلکہ وہ سیاست دان ہیں جنہوں نے تشدد کی سیاست کو اپنایا۔

وطنِ عزیز میں ابتدا ہی سے تشدد کی سیاست کا چلن رہا ہے۔ خان لیاقت علی خاں اس سیاست کی نذر ہوئے۔ پھر ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے بھرے اجلاس میں ڈپٹی اسپیکر شاہد کو نشانہ بنایا گیا۔

پنجاب میں تشدد کی سیاست کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ برطانوی نوآبادکاروں کا خیال تھا کہ پنجاب کو تشدد کے ذریعے ہی دبایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کی ہر تحریک کو بزورِ طاقت دبانے کی کوشش کی۔ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے ۱۳۰۰ سو راؤنڈ چلائے۔ جس سے تقریباً تین سو افراد ہلاک ہوئے، پھر خضر حیات ٹوانہ کی حکومت نے لاہور کو خاکساروں کے لہو سے سرخ کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب سفید فام کی جگہ سیاہ فام برسرِ اقتدار آئے، تو انھوں نے بھی پنجاب میں یہی خونیں ڈرامہ جاری رکھا۔ تحریک ختمِ نبوت کو کچلنے کے لئے بھی تشدد کی سیاست اپنائی گئی۔

پھر ایوب خان نے شب خون مارا اور کرسیٔ اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ایوب خان بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ پنجاب کو صرف اور صرف تشدد کے ذریعے ہی دبایا جا سکتا ہے۔ ایوب خان نے تشدد کی سیاست کو بروئے کار لانے کے لئے جس "گوہر" کا انتخاب کیا، وہ نواب آف کالاباغ امیر محمد خان تھا، نواب آف کالاباغ نے پولیس کی بجائے غنڈوں کے ذریعے حکومت کرنے کا پروگرام بنایا اور اس پر عمل بھی کیا، پولیس کو اس لئے نظر انداز کر دیا گیا کہ پولیس کی ناجائز کاروائیوں کو عدلیہ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ حسن ناصر شہید کی مثال ایوب خان اور نواب آف کالاباغ کے سامنے تھی۔ مارشل لاء کے دور میں بھی حسن ناصر شہید کے ساتھیوں نے عدالتِ عالیہ میں حکومت اور پولیس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ عوام حقیقت سے ضرور آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ ایوب خان اور نواب آف کالاباغ نے غنڈوں کے ذریعے حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ایوب خان کے گرد دائیں اور بائیں بازو کے موقع پرست جمع ہو گئے تھے۔ موقع پرست وطن سے مخلص ہوتا ہے اور نہ قوم سے، بلکہ اسے صرف اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ یہ عناصر ذہنی طور پر جاگیردارانہ نظریات کے حامی ہوتے ہیں۔ اس لئے تشدد کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں اور نوکر شاہی کے تابع ہو کر تشدد کرتے ہیں۔

لیکن نواب ہونے کی وجہ سے کالاباغ کی تشدد آمیز سیاست کے اطوار مختلف تھے، وہ اپنے حریف کی حیثیت کے مطابق اقدام کرتا تھا، اپنی حیثیت کے مساوی افراد اور سیاست دانوں کو گولی کا نشانہ بنوا دیا کرتا تھا۔ ملک غلام جیلانی حکومت پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ چنانچہ نواب آف کالاباغ نے انھیں گولی سے اڑانے کا منصوبہ بنایا۔ غنڈوں نے گلبرگ کی کوٹھی نمبر ۱، پی پر حملہ کیا۔ لیکن ملک غلام جیلانی کی بجائے پی پی آئی کے ضمیر قریشی نشانہ بن گئے۔ باقی بلوچ زخمی ہوئے۔

نواب کالاباغ نے ایک لڑکے کو کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ دینے کی ہدایت کی، کالج کے ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر ریاض قدیر نے سفارش ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "داخلے کے قوانین اور ضابطہ کے مطابق اس لڑکے کو داخلہ نہیں مل سکتا۔" ڈاکٹر ریاض قدیر کی اس جراَتِ رندانہ پر نواب کالاباغ چراغ پا ہو گیا۔ ڈاکٹر ریاض قدیر کو قتل کروانا اپنی توہین اور اصولوں کی خلاف ورزی سمجھتے ہوئے یہ سزا دی کہ ڈاکٹر ریاض قدیر کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ ڈاکٹر ریاض کو اس سے شدید ذہنی صدمہ پہنچا اور وہ کئی ماہ ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔

مولانا عبدالستار نیازی میانوالی کے رہنے والے ہیں، نواب آف کالاباغ کا تعلق بھی اسی ضلع سے تھا، لیکن ان کی حیثیت نواب کالاباغ سے کمتر تھی۔ لہٰذا کالاباغ نے کوہستان کے دفتر کے نزدیک لکشمی چوک پر سرِعام غنڈوں کے ذریعے جوتے لگوائے۔ ستار نیازی کے لئے یہی سزا اس کے نزدیک کافی تھی۔

نواب آف کالاباغ نے اداکارہ نیلو کی جو درگت بنوائی، وہ کسی سے پوشیدہ ہے، نیلو کا "جرم" یہ تھا کہ اس نے ایک

کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت میں رقص کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ اسے غنڈوں کے ذریعے اغوا کروا لیا گیا۔ اور دھمکی دی کہ اگر اس ظلم کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی تو تمہاری جان کی خیر نہیں، حبیب جالب کو جب یہ خبر ملی تو وہ پکار اٹھا ع

تو کہ ناواقف آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے!

جنوری ۱۹۶۶ء میں اعلان تاشقند ہوا۔ لاہور کے طلبہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور مظاہرے کئے، ایک جانب تو حکومت نے اس تحریک کو تشدد سے دبایا، دوسری جانب نواب کالا باغ نے گورنر ہاؤس میں چند طلبہ کو بلایا۔ طلبہ آدھے گھنٹے تک گورنر ہاؤس کے ایک کمرے میں نواب آف کالا باغ کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ خیال تھا کہ گورنر طلبہ سے گفت و شنید کریں گے۔ لیکن نواب آف کالا باغ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی طلبہ کو موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے حکم دیا "نکل جاؤ، او بدمعاشی، غنڈہ گردی بند کرو"۔ نواب کالا باغ کے نزدیک طلبہ کے لئے یہی سزا بہت تھی، موصوف میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دشمنوں کو قتل کروا کر ان کی لاشیں غائب کروا دیا کرتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں بھی ایوب خان نے اسی پالیسی پر عمل کیا، وہاں منعم خان کو گورنر بنایا گیا۔ منعم خان مشرقی پاکستان کا نواب آف کالا باغ تھا۔ مشرقی پاکستان میں غنڈوں کی حکومت قائم کر دی گئی۔ جبار خان کے بیٹے کو اذیتیں دی گئیں۔ اور دوسرے عوام دوست عناصر کا لہو بہایا گیا۔ ان پالیسیوں کی وجہ سے ایوب خان مشرقی پاکستان میں اتنے غیر مقبول ہو گئے کہ جب وہ ڈھاکہ گئے تو عوام نے ان کی تصاویر کتوں کے گلے میں لٹکا کر خیر مقدم کیا۔ نواب آف کالا باغ اور منعم خان نے دوسروں کے لئے موت کا راستہ منتخب کیا اور خود بھی اسی راستے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

جہاں ظلم ہوتا ہے وہاں بغاوت ضرور ہوتی ہے۔ حکومتی تشدد کا جواب عوامی تشدد ہوتا ہے۔ چنانچہ ایوب خان کی تشدد کی سیاست کے جواب میں عوام نے بھی تشدد آمیز سیاست اپنائی۔ ایوب خانی تشدد کا عوامی تشدد سے جواب دیا گیا۔ پشاور کے جلسہ عام میں ہاشم نے ایوب خان پر فائرنگ کی۔

یہ واقعات ایوب خان کے اس دور میں رونما ہوئے۔ جب ۱۹۶۲ء کا آئین نافذ ہو چکا تھا، ایوبی جمہوریت کا دور دورہ تھا، ایوب خان اپنے آپ کو جمہوریت نواز اور عوامی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ "مجھے صرف جمہوری طریقے سے ہی اقتدار سے محروم کیا جا سکتا ہے"۔ چنانچہ جمہوریت کے نام پر اس نے پنجاب کے پانچ دریاؤں میں خون کے ایک چھٹے دریا کا اضافہ کر دیا تھا جو خیبر سے چاٹگام تک کرسی اقتدار کو سیراب کر رہا۔ اگرچہ ایوب خان جمہوریت کا دعویدار تھا، اور اس نے نام نہاد جمہوریت کے ذریعے اپنے اقتدار کو برقرار بھی رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اسے ریاستی تشدد کے جواب میں عوامی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جمہوریت کے دعویدار ایوب خان نے خود ہی جمہوری اقتدار کو چھوڑ دیا تھا اور اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لئے تشدد کی راہ اختیار کی تھی۔ لہٰذا عوام نے بھی جوابی تشدد کیا۔ اور ایوب خان کو اپنے سابق وزیر خارجہ کے ہاتھوں اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔

غلام جیلانی کی بجائے ضمیر قریشی بھینٹ چڑھ گئے

یحییٰ خان بھی تشدد کی سیاست پر گامزن رہا۔ اسی پالیسی کے تحت مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی نتیجتاً مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا۔

جب پاکستان پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی، تو عوام کے ذہنوں میں جمہوریت کا جو تصور تھا، وہ ایوبی جمہوریت سے مختلف تھا، اگر عوام کو بتا دیا جاتا کہ پیپلز پارٹی کی جمہوریت بھی ایوبی جمہوریت جیسی ہوگی، تو عوام لازمی طور پر انتخابات کا راستہ اختیار نہ کرتے، وہ ترقی پسند اور انقلابی طاقتیں جو انتہائی ایمانداری اور دیانت داری سے عوام کو انتخابات اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حقیقت سے آگاہ کر سکتی تھیں، ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی، اس کے علاوہ ایوب خان کے خلاف تحریک کے دوران عوام کا ذہنی رجحان طبقاتی سیاست کی بنیادوں پر استوار نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس تحریک کی بنیاد شخصیات پر تھی، چنانچہ اگر انقلابی طاقتیں انتخابات میں عوام کو حصہ نہ لینے کا مشورہ دیتیں تو عوام ان مشوروں کو قبول نہیں کرتے، لہٰذا انقلابی عناصر کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ عوام کا ساتھ دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو تنہا رہ جاتے۔

انتخابات سے پہلے اور بعد میں بھی ملک کی سیاسی رہنمائی پنجاب کر رہا تھا، انتخابات میں سندھ سے وڈیرے، بلوچستان سے سردار، سرحد سے خوانین اور کٹھ ملّا کامیاب ہوئے۔ پنجاب سے کامیاب ہونے والوں کی اکثریت درمیانے درجہ کے طبقے پر مشتمل تھی، پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں درمیانے طبقے کے افراد نے اکثریت حاصل کی اور مرکز میں بھی اس طبقہ کو متوازن حیثیت ملی، جبکہ پیپلز پارٹی کی قیادت کی کوشش تھی کہ جاگیرداروں اور صاحب حیثیت افراد منتخب ہوں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے حکومت سنبھالنے کے بعد پنجاب کے عوام کی خواہشات کا احترام نہیں کیا اور پنجاب پر ایسے افراد کو مسلط کیا گیا جو طبقاتی لحاظ سے جاگیردارانہ مزاج رکھتے تھے۔ مصطفیٰ کھر کو گورنر بنایا گیا۔ حالانکہ شیخ رشید عوام میں زیادہ مقبول تھے، اس میں صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی، لیکن شیخ رشید کو مرکز میں ایسی وزارت دی گئی جو اس استحصالی نظام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مصطفیٰ کھر کو گورنر بنانے کے ساتھ ساتھ وہ اختیارات بھی دے دیئے، جو ایوب خان کے زمانے میں نواب آف کالا باغ کو حاصل تھے، دوسری جانب سندھ میں تمام اختیارات وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو کے سپرد کر دیئے گئے جس سے میر رسول بخش تالپور گورنر سندھ صرف آئینی سربراہ رہ گئے، مصطفیٰ کھر کو انتظامی امور کے اختیارات دینے کی وجہ سے پورے صوبے کی انتظامی مشینری مفلوج ہو گئی، وزیر اعلیٰ پنجاب معراج خالد عضو معطل بن کر رہ گئے۔ یہاں مرکزی حکومت سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے پنجاب اور سندھ میں دو مختلف معیار کیوں اپنائے۔ اگر معراج خالد میں انتظامی امور سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں ہے تو پھر انھیں وزیر اعلیٰ کیوں بنایا گیا۔

مصطفیٰ کھر نے اپنے پیشرو نواب کالا باغ کے تشدد کے راستے کو اپنایا اور پنجاب کے افتخار تاری کا راج نافذ کر دیا، مصطفیٰ کھر نے گورنر بنتے ہی پنجاب میں شیخ رشید کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوشش کی، لاہور میں صدر بھٹو کے جلسۂ عام میں افتخار تاری اور اس کے ساتھیوں نے شیخ رشید کے کارکنوں پر فائرنگ کی، پھر پیپلز پارٹی کے کنونشن میں شیخ رشید کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور کرانے کی ناکام کوشش کی گئی، دوسری جانب وزیر اعلیٰ پنجاب معراج خالد کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہر معاملے میں مداخلت کی گئی اور معراج خالد کے جلسوں میں فائرنگ کرائی گئی۔ ان کے جلسوں کو سبوتاژ کیا گیا۔

مصطفیٰ کھر کے دور حکومت میں پنجاب کے عوام، پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور حزب اختلاف پر کیا گذری، چند قابل ذکر واقعات درج ذیل ہیں۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کا پہلا نشانہ مختار رانا بنے، مختار رانا کا شمار پیپلز پارٹی کے صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ شیر لائلپور

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

ہفت روزہ
الفتح
کراچی
خاص مضمون

دربابِ سوشلزم وکمیونزم (آخری قسط)

کمیونزم کے مخالف کون ہیں؟

منہاج برنا

مارکس اور اینگلز سے پہلے ایسے متعدد مفکر اور رہنما گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے اَدوار کے معاشروں کی خرابیوں کو دُور کرنے کے خواب دیکھے تھے افلاطون کے زمانے سے لے کر انقلابِ فرانس تک مختلف اہلِ فکر اپنے اپنے انداز میں ایک ایسے مثالی معاشرے کی تصویر کھینچتے رہے جس میں عقل کو بالادستی ہو، جہاں افلاس، غلامی، لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی ناپید ہو اور جہاں مکمل مساوات اور برابری، خوشحالی اور یکسوئی کا دور دورہ ہو۔ سولہویں صدی عیسوی میں تھامس مور کی تصنیف "یوٹوپیا" میں ایک مثالی معاشرہ کا نقشہ کھینچا گیا تھا، اسی دور میں یورپ میں اینا باپٹیسٹ (ANA BAPTISTS) نامی ایک مذہبی فرقہ زوروں سے پھیلا، خصوصیت سے ہالینڈ، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں جو چرچ میں عہدوں، مراتب اور درجہ بندی کا مخالف تھا اور معاشرہ کی تمام اشیاء کو تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت تصور کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ۱۵۲۵ء میں جرمنی میں جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ انہوں نے جرمنی کے ایک مقام پر "منسٹر" کے نام پر ایک کمیون بھی قائم کیا تھا جہاں کی شہری زمین تمام لوگوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ پیسہ یا سکہ کا رواج ختم کر دیا گیا تھا، قیمتی اشیاء بحق کمیون ضبط کر لی گئی تھیں اور اشیاء لوگوں میں برابر تقسیم کی جاتی تھیں۔ بعد میں جاگیرداروں کی فوج نے اس کمیون کو چڑھائی کر کے ختم کر دیا لیکن یہ کوشش بیشتر نیک نیتی پر مبنی تھی اس میں حقیقت پسندی کو دخل نہ تھا۔

اس کے بعد ہمیں ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی کے تصوراتی سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظر آتے ہیں، جن میں فرانس کے چارلس فوریئر (۱۸۳۷،۱۷۷۲)، انگریز رابرٹ اوون (۱۸۵۸، ۱۷۷۱) فرانسیسی سینٹ سائمن (۱۸۲۵۔۱۷۶۰) اور روسی نراجی سوشلسٹ باکونن (۱۸۷۶۔۱۸۱۴) جن کا ذکر اینگلز نے تفصیل سے اپنی کتاب "خیالی اور سائنٹیفک سوشلزم" میں کیا ہے۔

یہ وہ دور ہے جب انقلاب فرانس کے بعد "آزادی، مساوات اور اخوّت" کے سرمایہ دارانہ نعرے یورپ میں ہر طرف گونج رہے تھے۔ جاگیرداری نظام بتدریج ٹوٹ رہا تھا اور نیا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اس پر تابڑ توڑ فتح حاصل کر رہا تھا، کیونکہ وہ جاگیردار طبقہ کے مقابلہ میں ترقی پسند تھا۔ لیکن لوگوں نے انقلاب فرانس کے بعد جلد ہی اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ بورژوا یا سرمایہ دار طبقہ نے "آزادی، مساوات اور اخوت" کے نعرے اپنے طبقاتی مفاد کو محفوظ کرنے کے لئے لگائے تھے، "آزادی" سے اس کی مراد سرمایہ دار طبقہ کی جاگیردارانہ قید و بند سے نجات اور مقابلہ اور تجارت کی آزادی تھی۔ مساوات سے اُس کی مراد اُس کے اپنے طبقوں کے افراد کی مساوات اور برابری کے تھے اور اخوت سے مراد بھی اس کے اپنے طبقہ کے افراد کا بھائی چارہ تھا۔

سرمایہ دار طبقہ کی فتح نئے مزدور طبقہ کے استحصال پر مہر ثبت کر دینے کے مترادف تھی۔ پرولتاریہ طبقہ ہر چیز سے محروم تھا۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو دیہاتوں میں قلاش ہونے کے بعد اور زمین سے محروم ہو کر محنت مزدوری کرنے کے لئے شہروں میں آئے تھے، ان کے پاس اپنی محنت کو فروخت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ محنت سرمایہ دار طبقہ خریدتا تھا اور اُسے معمولی اجرت پر اپنے کارخانوں میں محنت پر لگاتا تھا۔

رابرٹ اوون، سینٹ سائمن اور فوریئر نے سرمایہ دارانہ نظام کی اس لوٹ کھسوٹ کو خوب سمجھا۔ لیکن انہوں نے جو حل پیش کیا اُس کی بنیاد میں حقیقت سے زیادہ خیال اور خوش فکری پر مبنی تھیں۔ ان کے بارے میں اینگلز نے لکھا ہے کہ یہ حضرات ایک طبقہ کو آزاد کرانے کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ بیک وقت پوری انسانیت کی نجات کے متمنی ہیں۔ وہ فرانسیسی فلسفیوں کی طرح دنیا میں عقل اور ابدی انصاف کی سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر دنیا میں عقل اور انصاف کا بول بالا نہیں ہوا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ لوگ ان اچھائیوں کی ضرورت کو سمجھ نہیں سکے ہیں ان کے نزدیک جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ "ایک ایسا انسان پیدا ہو جو ان چیزوں کو سیکھ سکے۔ اور اب ایسا انسان پیدا ہو چکا ہے" (یعنی مردے از غیب بروں آید و کارے بکند)۔

لیکن لوگوں نے دیکھا کہ اس نوع کی عقل اور انصاف کی کوئی سلطنت قائم نہ ہو سکی۔ بلکہ بدحالی، افلاس، ظلم اور استحصال بڑھتا ہی چلا گیا۔ سینٹ سائمن، فوریئر اور رابرٹ اوون نے جس نظام کی تبلیغ کی اُسے کمیونسٹ مینی فسٹو میں "ابتدائی نوعیت کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظاموں" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور انہیں بنیادی طور پر خیالی یا تصوّراتی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اَصحاب ایک ایسے وقت میں "شہر اور دیہات کے فرق، خاندان اُجرت کے نظام کو ختم کرنے کے لئے عملی اقدامات تجویز کر رہے تھے اور ریاست کے لئے صرف پُرامن نگہداشت کے فرائض سونپنا چاہتے

کمیونسٹ دشمن، عوام دشمن ہوتا ہے

تھے جب کہ یہ تمام تضادات ابھی ابھرنا شروع ہوئے تھے، جنہیں ان مفکرین نے اپنی تصانیف میں صرف غیر واضح طور پر تسلیم کیا ہے اس لئے ان کی تجاویز محض خیالی اور تصوراتی نوعیت کی ہیں۔
(کمیونسٹ مینی فسٹو۔ مارکس انیگلز)

یہ حضرات پرولتاریہ یا مزدور طبقہ کے تاریخی فریضہ کا علم نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے کہ پرولتاریہ کے افلاس اور محرومی اور سرمایہ دار طبقہ کی بالادستی کی وجہ کوئی اتفاقی حادثہ یا عقل اور انصاف کی کمی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد خود طریقۂ پیداوار اور پیداواری رشتوں میں مخفی تھی۔

کارل مارکس اور انیگلز نے سب سے پہلے برسوں کی تحقیق، مطالعہ اور عمل کے بعد کائنات اور انسانی معاشرہ دونوں ہی میں تغیر و انقلاب کے سائنسی قوانین دریافت کئے۔ اور سوشلزم اور کمیونزم کے تصورات کو جو مجرد ابتدائی اور غیر سائنسی شکل میں اُن سے بہت پہلے سے پائے جاتے تھے ایک سائنسی اور حقیقی بنیاد فراہم کی لینن نے لکھا ہے کہ "اگر چند الفاظ میں مزدور طبقہ کے لئے مارکس اور انیگلز کی خدمات کو سراہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ——— انہوں نے مزدور طبقہ کو سکھایا کہ وہ خود کو سمجھے، خود آگاہی حاصل کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے خواب کی جگہ سائنس کو اپنایا۔"

اس ساری بحث اور حوالوں سے یہ نکتہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم کی اصطلاحات، اور اُن کا تصور دنیا میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اور ان کا مقصد ایک ایسے مثالی نظام کی ترجمانی کرنا تھا جہاں ظلم ناانصافی، لوٹ کھسوٹ بدامنی اور جہل نہ ہو۔ بلکہ مکمل مساوات، خوشحالی، اور انصاف کا دور دورہ ہو۔ لیکن جہاں یہ تصورات، مارکس اور انیگلز سے پہلے مجرد اور خیالی نوعیت کے تھے سائنٹیفک سوشلزم کے بانیوں نے انہیں سائنسی اور حقیقی بنیاد عطا کر دی۔

چنانچہ سوشلزم کو کمیونزم سے اور کمیونزم کو سوشلزم سے علیحدہ کر کے دیکھنا، یا دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف یا ایک دوسرے کی ضد قرار دینا یا تو انتہائی لاعلمی کا ثبوت ہے یا پرلے درجے کی بددیانتی ہے

آیئے اب یہ دیکھیں کہ سوشلزم اور کمیونزم پر علیحدہ علیحدہ یا بیک وقت کون لوگ حملے کرتے ہیں اور ان حملوں کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ ان عناصر میں سب سے پہلے تو وہ لوگ آتے ہیں جو سوشلزم کے بھی مخالف ہیں اور کمیونزم کے بھی۔ یہ لوگ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں متوسط طبقہ کے وہ دانش ور بھی شامل ہیں جو ذہنی طور پر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں اور جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ کی عینک ہی سے حقائق کو دیکھ سکتے ہیں یا دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں مذہبی ٹھیکہ دار اوّل درجہ پر ہیں۔ یہ مذہب کے نام پر اشتراکی اور اشتمالی معاشرہ کے قیام کے مخالف ہیں، کیونکہ اس نوع کے معاشرے کے قیام سے اُن کے طبقاتی مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ یہ بیشتر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خوشہ چیں ہوتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ کو مذہب کے نام پر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چھوٹا بڑا، اچھا بُرا، سرمایہ دار اور مزدور اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں۔ ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ نجی ملکیت ایک مقدس چیز ہے اس لئے اس کے خلاف آواز اٹھانا کفر اور گناہ ہے۔ اشتراکی اور کمیونسٹ لامذہب ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

سوشلزم اور کمیونزم کے مخالفین کا دوسرا گروہ دورِ جدید کے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور سیاست دانوں پر مشتمل ہے جن کے اپنے مفادات انہیں سرمایہ دارانہ نظام کا تابع بنا دیتے ہیں۔ ان میں سیاست دان بھی ہوتے ہیں، اور بڑے بڑے پروفیسر، ماہرینِ معاشیات، اور ماہرینِ سماجی علوم، بڑے بڑے سرکاری ملازم اور تکنیکی ماہرین۔ ان سب کی روزی، ترقی، پوزیشن اور خوشحالی سرمایہ دارانہ نظام سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ اس نظام کے محافظ ہوتے ہیں اور "جو کچھ ہے" (STATUS QUO) کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ مارکس نے کہا ہے کہ شعور یا تصور ہمارے وجود کو متعین نہیں کرتا بلکہ ہمارا وجود ہمارے خیالات اور شعور کو متعین کرتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بعد میں شعور کی اپنی اہمیت ہو جاتی ہے اور جب وہ منظم تحریک کی شکل اختیار کر لے تو وہ بھی حالات پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن۔ یہ اثر سماجی ارتقاء کے قوانین کے مطابق ہی ہوتا ہے، اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ اگر اس کے برعکس ہو تو ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس گروہ کے لوگ سیاسی، نظریاتی اور عملی ہر اعتبار سے کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ مارکس اور انیگلز کے مطابق انسانی معاشرہ میں اقتصادی عنصر یعنی طریقِ پیداوار، طریقِ ملکیت، تقسیم اشیاء کا طریقہ اور پیداواری رشتوں کی نوعیت بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اسی بنیاد پر سماج کا تہذیبی، ثقافتی اور قانونی ڈھانچہ تعمیر ہوتا ہے۔ یہ ڈھانچہ یعنی اس کے تصورات، نظریات اور قوانین، بلکہ اس کے رسوم و رواج اور انسانی عادات تک ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی بنیاد کو محفوظ رکھنے کے کام آتی ہیں۔ جب اقتصادی بنیاد تبدیل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ بالائی سماجی ڈھانچہ یعنی نظریات و خیالات، قوانین۔ رسوم و رواج اور عادات و اطوار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔

چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس کا نظام تعلیم اس کے نظریات، اس کے قوانین، اس کے رسوم و رواج، اس کی ریاستی مشنری سب کے سب سرمایہ دارانہ نظام ہی کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ہر اس خیال اور نظریات کی جو اس نظام کے خلاف ہو یا اس پر ضرب لگاتے، شدت سے مخالفت کی جاتی ہے۔

لیکن اشتراکی اور اشتمالی نظام کے سب خطرناک مخالفین گروہ ان لوگوں، سیاست دانوں اور ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے جو اشتراکیت اور سوشلزم کے علمبردار بنتے ہیں لیکن دراصل اشتراکی نعروں کے پردے میں سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یہ لوگ دراصل منافق ہوتے ہیں۔ یعنی یہ ہوتے کچھ ہیں اور خود کو ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

دراصل یہ گروہ انیسویں صدی میں منظم اشتراکی تحریک کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ وہ چالاک لوگ تھے جو یہ جان چکے تھے کہ اب سرمایہ دارانہ نظام رُو بہ زوال ہو چکا ہے، پرولتاری طبقہ انقلاب کے لئے منظم ہو رہا ہے۔ مظلوم عوام متحد ہو رہے ہیں، جو اپنے انقلابی عمل کے ذریعے سرمایہ دار طبقہ کے ظالمانہ اقتدار کو ختم کر دیں گے اور سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیں گے۔ چنانچہ سوشلزم اور کمیونزم کی اس عالمگیر تحریک کو روکنے کے لئے انہوں نے دو طریقے سوچے اور ان پر عمل کیا۔

پہلا قدم تو انہوں نے یہ اٹھایا کہ چونکہ اب اشتراکیت کی ہوا چل چکی ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت ترک کرو، اور سوشلزم کے علمبردار بن جاؤ۔ وہ قصہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جب ایک چور کو پکڑنے کے لئے لوگوں نے دوڑنا شروع کیا تو چور ان میں مل گیا اور خود بھی "چور چور" کی آوازیں لگانے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ بھی سرمایہ داروں کے مخالف بن گئے اور سوشلزم کی ہمنوائی کرنے لگے۔ لیکن انھوں نے اس کے ساتھ سوشلزم کے نظریات میں تحریف اور ترمیم بھی شروع کر دی۔ اپنی لفاظی اور طراری اور دھوکہ دھڑی کو استعمال کر کے انہوں نے سوشلزم کی تعبیر کچھ اس طرح شروع کی جس سے یہ انقلابی نظریہ ایک اصلاح پسندانہ اور موقع پرستانہ تصوّر میں تبدیل ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ اب حالات ایسے ہیں کہ بغیر انقلاب اور انقلابی عمل کے صرف اشتراکی نظریات (وہ بھی ان کی اپنی اختراع کے) کو پھیلا کر لوگوں سے ووٹ حاصل

کر کے اور پارلیمنٹ میں بیٹھ کر قوانین منظور کرا کے اشتراکیت کو نافذ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مزدور طبقہ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اشتراکی نظام کے قیام کے لئے انقلابی عمل کی ضرورت نہیں۔ سرمایہ دارانہ ریاست اور اس کی ریاستی مشینری کو توڑنے کی ضرورت نہیں، صرف اپیل کرنے اور ووٹ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ووٹ حاصل کر کے سرمایہ دارانہ نظام کے ریاستی ڈھانچہ میں رہتے ہوئے چند صنعتوں کو قومیانے اور بڑی جاگیرداری اور زمینداری کو ختم کر کے چھوٹے یا متوسط درجہ کی زمین داری اور جاگیرداری کو قائم کر دینا کافی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ کہ اشتراکیت کے نام پر سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو نئے رنگ و روغن کے ساتھ محفوظ کر لیا جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یورپ میں انواع و اقسام کی سوشلسٹ پارٹیاں قائم کیں۔ مثلاً جمہوری سوشلسٹ پارٹی، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، کرسچین سوشلسٹ پارٹی وغیرہ۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ایک عرصہ سے جمہوری سوشلزم اور کرسچین سوشلزم (عیسائی اشتراکیت۔ اسی کے تتبّع میں یہاں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی گئی ہے) کی تحریکیں چلائی گئی ہیں جن کا واحد مقصد سوشلزم کے نام پر مزدور طبقہ اور مظلوم عوام کو دھوکہ دینا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سوشلزم کے ان منافقوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب کے سب خود کو کمیونزم اور کمیونسٹوں کا کٹر دشمن قرار دیتے ہیں۔ یعنی ایک طرف سوشلزم کے علمبردار ہیں اور دوسری طرف کمیونزم کے مخالف۔ اس نوع کے سوشلزم کے علمبرداروں میں کئی اور چیزیں مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ میں آپ کو مختلف ملکوں میں ایسی متعدد سوشلسٹ پارٹیاں مل جائیں گی۔ جو عملاً نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے کی حامی ہیں۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی ہو یا فرانس کی سوشلسٹ پارٹی۔ اگر آپ ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے کس طرح نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کو مختلف شکلوں میں برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ بلکہ اس مقصد کے لئے جنگ جارحیت سے بھی گریز نہیں کیا۔ جب ۵۶ء میں سوئیز پر حملہ کیا گیا تو فرانس میں جو حملہ آوروں میں تھا ایک سوشلسٹ پارٹی ہی حکمران تھی۔ سابق برٹش گیانا میں چیڈی جگن کی جمہوری طور پر منتخب حکومت کو لیبر پارٹی کی حکومت نے برطرف کیا تھا۔ اور پاکستان کے خلاف ۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ہندوستان کی جارحیت ایک ایسی حکمران پارٹی کی قیادت میں رو بہ عمل آئی جو خود کو سوشلزم کی علمبردار قرار دیتی ہے۔ یعنی کانگریس پارٹی۔

کمیونزم کے مخالف نکسن، چیانگ اور تھیو کے ساتھی ہیں

ان نام نہاد سوشلسٹوں میں جو کمیونزم کے مخالف ہیں ایک اور قدرِ مشترک انقلابِ روس اور انقلابِ چین کی مخالفت ہے۔ روس کے عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد یورپ کی متعدد نام نہاد سوشلسٹ پارٹیوں نے اکتوبر انقلاب کو ختم کرنے کے لئے سامراجی ممالک کا ساتھ دیا تھا، اسی طرح آج بے شمار نام نہاد اشتراکیت کے علمبردار جن میں ترمیم پسند کمیونسٹ بھی شامل ہیں، چین کے انقلاب اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی مخالفت کر رہے ہیں۔

یہ لوگ کس بنیاد پر انقلابِ روس، انقلابِ چین، کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹیوں کی مخالفت کرتے ہیں؟

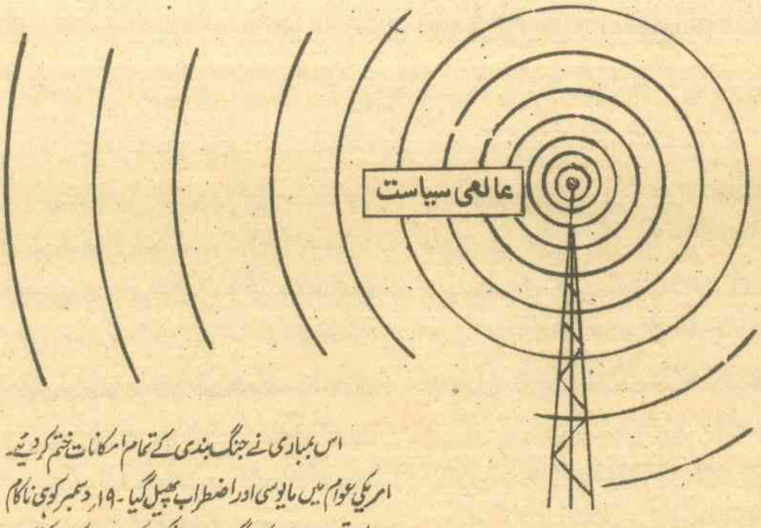
یہ لوگ کہتے ہیں کہ چین اور روس میں جمہوریت نہیں۔ یعنی اس طرز کی جمہوریت نہیں جو مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت اور جمہوری نظام چین اور روس میں نہیں پایا جاتا۔ جی ہاں وہاں بھوکا رہنے، مظلوم رہنے، بھیک مانگنے، بیمار ہونے کی صورت میں علاج نہ کرا سکنے، تعلیم سے محروم ہونے، اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت و آبرو لٹانے کی آزادی نہیں ہے۔ لیکن جن ملکوں کو جمہوری کہا جاتا ہے وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کے ۸۰ فیصد عوام کا معیارِ زندگی کیا ہے۔ جائیے امریکہ کے نیگرو عوام کی حالت دیکھئے۔ فرانس کی مزدور بستیوں کا چکر لگائیے۔ اور ایشیاء میں ہندوستان کے عوام کی حالت دیکھئے تو آپ کو پتہ چل جائیگا کہ مغربی جمہوریت کا مطلب محنت کش عوام کے لئے کیا ہوتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں مزدوروں کو مکھی مچھروں کی طرح گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اسے سوشلزم، جمہوریت اور اسلامی سوشلزم کا نام دیا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے بزرگ جمہوریت پسند اور سوشلسٹ حضرات کو نہ جمہوریت کا خیال آتا ہے اور نہ سوشلزم کا۔ سائیٹ میں چالیس بیالیس اور لانڈھی میں ان گنت مزدور ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ سینکڑوں کو جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے، اور کسی کی جمہوری رگ نہیں پھڑکتی۔ ہاں اگر ان کے طبقہ کا ایک سیاست داں ہلاک کر دیا جائے تو مانا کہ قابلِ افسوس بات ہے۔ تو ان نام نہاد سوشلسٹوں سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور دانشوروں اور ان کے پالتو ایجنٹوں کو سخت قلق ہوتا ہے پھر انہیں خیال آتا ہے کہ یہ جمہوریت نہیں، یہ فاشزم ہے۔

دراصل آج کے دور میں جو شخص کمیونزم اور کمیونسٹوں کی مخالفت کرتا ہے وہ یقینی طور پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ ہے۔ اور اگر وہ اس کے ساتھ سوشلزم کا دم بھرتا ہے تو وہ زیادہ عوام دشمن ہے۔ آج کی دنیا میں چیانگ کائی شیک، نکسن، گولڈا میئر، تھیو جیسے لوگ کمیونزم اور کمیونسٹوں کی مخالفت کرتے ہیں یہ سب کے سب انقلاب کے مخالف ہیں، یہ سب کے سب جنگ و جارحیت، لوٹ کھسوٹ اور نوآبادیاتی نظام اور نسلی امتیاز کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ اس لئے جو بھی کمیونزم کی مخالفت کرتا ہے وہ ناگزیر طور پر انسانیت، محنت کش عوام، مزدور طبقہ اور دنیا بھر کے ترقی پسند اور آزادی پسند عوام کے دشمنوں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی جو لوگ ایک طرف سوشلزم کے حامی ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف کمیونزم کی مخالفت پر مُصر ہیں، وہ بھی مذکورہ بالا عوام دشمن افراد اور طاقتوں کے ساتھی ہیں۔ اور اس لئے ان کا عمل واضح طور پر عوام دشمن اور مزدور دشمن ہے۔

یہ لوگ دراصل کمیونزم کے ساتھ سوشلزم کے بھی دشمن ہیں کیونکہ یہ سرمایہ داری، جاگیرداری اور عالمی سامراج کے استحصالی نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ذرا تامل کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے طبقاتی مفادات انہی استحصالی طبقوں کے مفادات سے وابستہ ہیں۔ یہ اتنے ڈھیٹ اور بے شرم ہیں کہ چین جیسے ملک پر بھی، جس نے ہمیشہ پاکستان کی آزادی اور اقتدارِ اعلیٰ کے تحفظ کی جد و جہد میں پاکستانی عوام کا ساتھ دیا ہے، حملہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اور پھر دوسری ہی سانس میں اس خیال سے کہ عوام اس کا بُرا نہ مانیں وہ فوراً اس کے طرزِ عمل کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن ان جعلی سوشلسٹوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نہ چین انقلاب کی درآمد و برآمد میں یقین رکھتا ہے، اور نہ پاکستان کے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی دوسرا ملک انہیں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی لعنت سے نجات دلا سکتا ہے۔ پاکستان کے باشعور عوام اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور عوام کی طاقت ملک کی جملہ عوام دشمن طاقتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ عوام دشمن، سرمایہ دار اور جاگیردار طاقتیں اپنی ایڑی چوٹی کا کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لیں، وہ اپنی استبدادی طاقت پر کتنا ہی یقین کیوں نہ کر لیں، پاکستان کے عوام

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



ویت نام

۹۔ پیارے ہنری! مذاکرات مکمل ہونے کے بعد کیا تم، مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں مارکسزم کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے کام نہیں دلا سکتے،

۹۔ بڑی خوشی سے، لیکن مجھے بھی ہنوئی یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھانے کی اجازت ملنی چاہیئے،

ویت نام میں عارضی جنگ بندی کے لعد پیرس میں مذاکرات شروع ہوئے۔ شمالی ویت نام کی نمائندگی لی دوک تھیو اور امریکہ کی ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے کی، دونوں بنیادی طور پر پروفیسر ہیں، عارضی جنگ بندی اور صدر نکسن کے بیانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ویت نام میں مستقل جنگ بندی کی امید پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ لی دوک تھیو اور ڈاکٹر کیسنگر میں سویا ہوا پروفیسر جاگ اٹھا، اور دورانِ مذاکرات دونوں جانب سے مذاقاً یہ جملے کہے گئے۔

ادھر پیرس میں مذاکرات جاری تھے، امن کی باتیں ہو رہی تھیں، ادھر وہائٹ ہاؤس میں نئی جنگ کے نقشے مرتب کئے جا رہے تھے، منصوبے بن رہے تھے۔ امریکی فوجی حکام بمباری کے لئے شمالی ویت نام کے اہم مقامات پر نشان لگا رہے تھے۔ صدر نکسن اور امریکی وزیر دفاع لیرڈ بمباری کا جواز تلاش کر رہے تھے، جب منصوبہ بندی مکمل ہو گئی۔ تو ۱۹ دسمبر کو امریکی سامراج نے عارضی جنگ بندی کی دھجیاں اڑا دیں۔ ۱۹ دسمبر کو اچانک شمالی ویت نام پر زبردست بمباری شروع کر دی گئی۔ اتنی شدید بمباری پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی، اس مرتبہ شمالی ویت نام کے ممنوعہ علاقے کو بھی بمباری کا نشانہ بنایا گیا، شمالی ویت نام کی بحریہ کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ اور اطراف میں سمندری بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ ہنوئی اور ہائیفونگ کی بندرگاہ پر بھی بمباری کی گئی۔

اس بمباری نے جنگ بندی کے تمام امکانات ختم کر دیئے۔ امریکی عوام میں مایوسی اور اضطراب پھیل گیا۔ ۱۹ دسمبر کو ہی ناکام صدارتی امیدوار میک گورن نے نکسن حکومت پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ "صدر نکسن نے انتخابات کے موقع پر ویت نام میں عارضی جنگ کر کے، امریکی عوام کو دھوکہ دیا تھا۔" ۱۹ دسمبر کی شام تک امریکی حکومت ہنوئی ریڈیو کی اس خبر کو کہ "شمالی ویت نام کے ممنوعہ علاقہ پر بمباری کی گئی ہے۔" کی تردید کرتی رہی۔ لیکن رات کو امریکی وزیرِ دفاع لیرڈ نے ایک پریس کانفرنس میں اس وحشیانہ جنگی جرم کا اقبال کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ "پورے شمالی ویت پر بمباری کی جا رہی ہے۔" لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ "اگر میں نے خاص مقامات کی نشان دہی کر دی تو، ہمارے بمبار طیاروں کے عملہ کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی۔" تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا۔ ۱۹ دسمبر کی رات کو، ہی وہائٹ ہاؤس سے ایک اعلان جاری کیا گیا۔ جس میں بتایا گیا کہ "شمالی ویت نام کے دارالخلافہ ہنوئی اور سب سے بڑی بندرگاہ ہائیفونگ پر بمباری کا حکم خود صدر نکسن نے دیا تھا۔ کیوں کہ کمیونسٹ ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہے تھے۔

دن بدن بمباری شدت اختیار کر رہی ہے۔ امریکی سامراج شہری علاقوں، ہسپتالوں اور غیر ملکی سفارت خانوں کو بھی بمباری کا نشانہ بنا رہا ہے۔ ۱۲ دسمبر کو شمالی ویت نام کے ایک ہسپتال پر بمباری کی گئی۔ جس سے کئی ڈاکٹر ہلاک ہو گئے۔ ہنوئی کا ہوائی اڈہ اور ریلوے اسٹیشن تباہ کر دیا گیا۔ بعض غیر ملکی سفارت خانوں کو بھی شدید نقصان پہنچا، ۲۲ دسمبر کو امریکی بمبار سے بھارت، مصر اور کیوبا کے سفارت خانے تباہ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مطابق بھارتی سفارت خانہ اور عملہ کے تمام کوارٹرز ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے۔ اس وحشیانہ بمباری سے ہنوئی میں امریکی جنگی قیدیوں کا کیمپ بھی نہیں بچ سکا۔ ریڈیو ہنوئی کے مطابق بمباری سے متعدد امریکی جنگی قیدی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اسی دن ہائیفونگ کی بندرگاہ میں پولینڈ کا ایک تجارتی جہاز بمباری سے غرق ہو گیا۔ سوویت یونین اور چین کے جہازوں کو نقصان پہنچا۔

اگرچہ اچانک امریکی بمباری سے شمالی ویت نام کا کافی نقصان ہوا ہے لیکن شمالی ویت نامیوں کے حوصلے بلند ہیں۔ اور پامردی سے امریکی جارحیت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ۲۲ دسمبر تک شمالی ویت نام نے ۲۷ امریکی طیاروں کو مار گرایا۔ اور شمالی ویت نام کے وزیرِ دفاع جنرل گیاپ نے شمالی ویتنامی فوج کی ۲۸ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس عزم کا اعادہ کیا کہ شمالی اور جنوبی ویت نام کو متحد کرنے کی جدوجہد جاری رہے گی، شمالی ویت نامی عوام امریکی سامراج کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

امریکی سامراج بمباری کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ "شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام جنگ بندی کے لئے ایسے چند مراعات دینا نہیں چاہتے، اس لئے بمباری ناگزیر ہو گئی ہے۔" چنانچہ ۱۲ دسمبر کو صدر نکسن کے شمالی اور جنوبی ویت نام کو دھمکی بھی دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر جنوبی ویت نام کے صدر جنرل تھیو نے چند مراعات نہیں دیں تو جنوبی ویت نام کی فوجی اور اقتصادی امداد بند کر دی جائے گی۔ شمالی ویت نام کو دھمکی دیتے ہوئے کہا گیا کہ اگر اس نے مراعات نہیں دیں تو بمباری تیز کر دی جائے گی۔

اب ثابت ہو گیا ہے کہ ویت نام میں عارضی جنگ بندی، معاہدہ امن کی تیاریاں اور قیام امن کی گفت و شنید محض ایک ڈھونگ تھا۔ صدر نکسن ویت نام میں مستقل جنگ بندی نہیں چاہتے امریکی سامراج نے ویتنام میں عارضی جنگ بندی اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ امن اور آزادی کا علمبردار ہے۔ بلکہ ویتنام کے جیالے عوام نے برسوں کی مسلح جدوجہد اور قربانیوں سے یہ تسلیم کروا دیا تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہیں، امریکہ کے جدید طرز ہتھیار بھی ان کے شمالی اور جنوبی ویت نام کو متحد کرنے کی جدوجہد کو کند نہیں کر سکے، شمالی ویتنامی گوریلوں اور ویت کانگ نے امریکی سامراج کی کمر توڑ کر رکھ دی، دوسری جانب ویتنام کی جنگ نے امریکی سامراج کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔ کھربوں ڈالر جنگ پر خرچ کرنے سے ترقیاتی منصوبوں پر عمل نہیں ہو سکا، جس سے بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، جنگی اخراجات پورا کرنے کے لئے نت نئے ٹیکس لگائے اور خسارے کا بجٹ پیش کیا۔ جس سے افراطِ زر ہوا۔ اور گرانی بڑھنے لگی اور ڈالر کی ساکھ مسلسل گرنے لگی۔ ان باتوں سے امریکی عوام میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا۔ امریکی عوام نے ویت نام میں امریکی مسلح جارحیت کی مخالفت اس لئے بھی کی کہ ان کے رشتے دار، دوست احباب بھاری تعداد میں اس جنگ میں ہلاک ہوئے۔ ویت نام کی جنگ میں یکم جنوری سے ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک ۴۵۸۸۶ امریکی سپاہی لڑتے ہوئے ہلاک ہوئے، ۱۰۲۸۱ امریکی سپاہی ویت کانگ کے اچانک حملوں کے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

درآمد شدہ اشیاء پر

پچیس سے تیس فیصد

اضافے کا امکان

بین الاقوامی مال برداری کے کرائے میں اضافہ

سامراج کی خطرناک سازش

قطب الدین احمد

مقامی پریس کی ایک خبر کے مطابق برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کانفرنس لائنز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمام مال بردار جہازوں پر جو کہ یورپ کی مختلف بندرگاہوں سے مشرق کے لئے تجارتی سامان لانے والے ہیں۔ ان پر ۴ر دسمبر ۱۹۷۲ء سے مال برداری کے کرایہ میں پندرہ فیصد کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔ باخبر حلقوں نے اسے عام طور پر خطرہ کی گھنٹی قرار دیا اور اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ دوسرے سامراجی ممالک کی شپنگ کمپنیاں بھی کانفرنس لائنز کے نقشِ قدم پر اپنے کرایہ میں اسی تناسب سے اضافہ کر دیں گی اور یہ اندیشہ حقیقت کے روپ میں ظاہر ہونے لگا ہے کیونکہ کینیڈا شپنگ لائنز لمیٹڈ نے بھی اس ارادے کا اظہار کیا ہے کہ ان کے مال برداری کے کرایہ میں یکم فروری ۱۹۷۳ء سے ساڑھے بارہ فیصد کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ درحقیقت کانفرنس لائنز کی اس شاطرانہ چال کا مقصد بین الاقوامی طور پر مال برداری کے کرایہ میں بارہ سے پندرہ فیصد کا مزید اضافہ کرنا تھا اور انہوں نے ایک خیالی اور بے بنیاد عذر گھڑ کر اس کے لئے جواز پیدا کیا ہے۔

عذرِ لنگ

کانفرنس لائنز نے جو وجوہات بیان کی ہیں وہ کافی دلچسپ اور پُر معنی ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق کراچی کی بندرگاہ پر پچھلے چند ماہ میں جہازوں کا ہجوم لگا ہوا تھا، کیونکہ یہاں جہازوں سے مال اتارنے اور چڑھانے کا انتظام ان کی نظر میں ناقابل تشفی ہے۔ پھر اختتامیہ جملوں میں بیان کرتے ہیں کہ اس ناقص انتظام کی وجہ سے ان کے جہازوں پر اخراجات میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ کراچی بندرگاہ کی انتظامیہ (کراچی پورٹ ٹرسٹ) نے اس الزام کی پُر زور تردید کی ہے۔ اگر بفرضِ محال ان کے "جہازوں کے ہجوم" کا عذر مان بھی لیا جائے تو ایسا کسی خاص وقت یا زیادہ سے زیادہ کسی خاص ماہ میں ہو سکتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں مال برداری کے کرایہ میں مستقل اضافہ اور اتنے بڑے تناسب سے اضافہ کا کوئی قابلِ فہم اور منصفانہ جواز ثابت نہیں ہوتا۔ باخبر حلقوں نے اسے سامراجی استحصال کا ایک نیا طریقہ قرار دیا ہے۔ اس قسم کا یکطرفہ فیصلہ درحقیقت ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادی بدحالی اور ان کی بیچارگی کے باعث سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی بدترین مثال ہے۔

گماشتوں کا مجرمانہ گٹھ جوڑ

اس واقعہ کے پس پردہ مقامی سرمایہ داروں، گماشتوں، ملک دشمن عناصر اور سامراجی ایجنٹوں کے خون آلود ہاتھوں کا سراغ ملتا ہے۔ سازش کافی پرانی ہے، مگر اس کا ردِ عمل اب برِ عام ہوا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ پچھلے چھ مہینوں سے کراچی کے مزدوروں کے خلاف سرمایہ داروں نے اپنا گھناؤنا اور مکروہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ کراچی کے مزدوروں کا شمار دنیا کے بہترین جفاکش اور محنتی مزدوروں میں ہوتا ہے۔ مگر سرمایہ داروں اور ان کے پریس پر اجارہ داری کی وجہ سے مزدوروں کو مسلسل مطعون کیا جاتا رہا یہاں تک کہ ایسی تمام بے بنیاد اور من گھڑت خبریں بین الاقوامی اخباروں میں بھی آنے لگیں۔ یہ کوئی حادثاتی عمل نہیں تھا۔ دراصل ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ایسے تمام لوازم فراہم کئے جا رہے تھے تاکہ ہمارے سرمایہ داروں کے بیرونی آقاؤں کو ان کی لوٹ کھسوٹ کیلئے جواز فراہم کیا جا سکے۔ اس خیال کی سچائی بعد کے واقعات سے بھی ثابت ہوئی ہے۔ مال برداری کے کرایہ میں اتنا بڑا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ملکی معیشت پہلے ہی بحران سے دوچار ہے سامراجیوں کے مزید استحصالی ہتھکنڈوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی طور پر مال برداری کے کرایہ میں اضافہ سے ملک کو بیش بہا زرِ مبادلہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ مگر ایسی گمبھیر اور پُر آشوب صورتِ حال میں ہمارے نام نہاد محبِ وطن سرمایہ داروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام ملکی اور غیر ملکی اثر و رسوخ کے باوجود خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

پاکستانی اور ہندوستانی ممبروں کا احتجاج

پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے تمام ترقی یافتہ یورپ کے ممالک بھی کانفرنس لائنز کے ممبر ہیں۔ مال برداری کے کرایہ میں اضافہ یا کمی سارے ممبروں کے متفقہ فیصلہ سے ہونا چاہیئے تھا۔ مصدقہ ذریعوں کا کہنا ہے کہ اس فیصلہ میں پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کی تمام تر مخالفت کے باوجود ترقی یافتہ ملکوں نے یکطرفہ اور آمرانہ فیصلہ صادر کر دیا، جس سے خاص طور پر ترقی پذیر ممالک ہی متاثر ہوں گے۔ ترقی یافتہ ملکوں کا ایسا اجارہ داری کا رویہ یقینی طور پر قابلِ مذمت ہے۔ اس واقعہ سے کچھ حلقوں میں مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے یہ امید لگا رکھی تھی کہ ترقی یافتہ ممالک بجائے امداد اور قرضے دینے کے ترقی پذیر ممالک کو زیادہ سے زیادہ تجارتی مواقع فراہم کریں

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

ہفت روزہ

الفتح

۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا کراچی ۲۹

کلرک نمبر —— مارچ میں شائع ہوگا

۱۰۰ روپے سے ۵۰۰ روپے تک کے انعامات

کلرکوں پر کیا گزرتی ہے؟

۱- کلرکوں کے معاشی، معاشرتی مسائل اور ان کا حل

۲- بدعنوان افسروں کا پردہ چاک

۳- کلرک کی سچی آپ بیتی

۴- محکموں یا اداروں کی اندرونی کہانیاں

۵- ملازمت کیسے ملی

۶- ناقابل فراموش واقعات

۷- کلرک۔ ٹریڈ یونین کا بہترین کارکن

۸- کلرک: جو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنا

کسی ایک عنوان پر لکھیئے۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف، صاف اور ستھرا لکھا جائے۔ ہر موضوع میں سے بہترین مضمون پر انعام دیا جائے گا۔ وصولی کی آخری تاریخ ۳۱ جنوری ۷۳ء ہے۔ اپنے مضمون کے ساتھ درج ذیل کوپن ضرور بھیجئے، اس کے بغیر مضمون مقابلے میں شامل نہیں ہوسکے گا۔ مصنف کی خواہش پر اس کا نام اور پتہ مخفیہ رکھا جائیگا۔

کوپن

نام ———— دفتر کا پتہ ————————

رہائش کا پتہ ———— تاریخ ————————

میں منصفین کے فیصلے کا پابند ہوں گا — دستخط

انچارج انعامی مقابلہ۔ ہفت روزہ الفتح۔ ۸۰ ڈی۔ نرسری (کمرشل ایریا) کراچی-۲۹ فون ۴۱۲۲۷۴

سفرنامہ چین

۱۰

احفاظ الرحمٰن

ایک گوریلا ہیرو کامریڈ لے چی فو سے ملاقات

زمین کے مقابلے میں انسانوں کا تحفّظ زیادہ ضروری ہے



گوریلا ہیرو، کامریڈ لے چی فو کے ساتھ

چاؤیوان کی رہائش گاہ جس علاقے میں واقع ہے، اس بریگیڈ کی پارٹی برانچ کے سیکرٹری لے چی فو جاپان اور کومنتانگ کے خلاف جنگِ مزاحمت میں حصّہ لے چکے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۵۴ سال ہے۔ وہ نویں کانگریس کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

ہم پارٹی برانچ کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سامنے پلیٹوں میں چاؤیوان کے باغات کے پھل رکھے ہوتے تھے۔ لے چی فو نے شمالی شینسی کے کسانوں کی طرح روایاتی انداز میں اپنے سر پر سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی تولیہ لپیٹ رکھی تھی۔ چونکہ وہ جنگِ مزاحمت میں حصّہ لے چکے ہیں، اس لئے میں نے ان سے تمام سوالات گوریلا جنگ کے بارے میں کئے۔

کامریڈ لے چی فو نے جو کہانی سنائی، وہ بڑی دلچسپ تھی ———

جس وقت صدر ماؤ شمالی شینسی میں تھے، اس وقت لے چی فو بہت کم عمر تھے۔ وہ ۴۷ء میں گوریلا دستے میں شامل ہوئے تھے۔ اس وقت ینان کے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں چار گوریلا دستے متعین تھے۔ لے چی فو مغربی دستے کے رکن تھے۔ اس وقت ان کے پاس ہتھیاروں کی سخت قلت تھی۔ ہر گوریلا کے پاس ایک رائفل، تین راؤنڈ گولیاں، دو دستی بم اور دو بارودی سرنگیں ہوتی تھیں۔ اس بے سروسامانی کے باوجود وہ ہر محاذ پر ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ خالی بیلٹوں میں کاؤلیانگ (جوار کی قسم کا ایک اناج) کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگا لیتے تھے، تاکہ دشمن کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ ان کے پاس کارتوس نہیں ہیں۔ دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے وہ اس قسم کی ان گنت ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔

لے چی فو کے گوریلا دستے میں چار سو اراکین تھے۔ اس دستے نے شروع میں نان نی وان کی طرف مارچ کیا۔ اس دوران پندرہ دن تک دشمن قدم قدم پر انہیں ہراساں کرتا رہا، لیکن وہ پہاڑی راستوں سے ہو کر لڑتے بھڑتے آگے کی طرف بڑھتے رہے۔ ۱۷ مارچ کو انہیں وہاں سے واپس بلا لیا گیا۔ ۱۰ مارچ کو مرکزی کمیٹی نے سرخ افواج اور گوریلا دستوں کو ینان سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا حکم دیا۔ سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں لڑے بغیر ینان چھوڑنے کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے۔

دراصل اس وقت دشمن کی دو لاکھ تیس ہزار افواج ینان کی طرف بڑھ رہی تھیں، جبکہ سرخ افواج کی تعداد صرف بیس ہزار تھی۔ اس طرح ان سے لڑنا مہم جوئی کے مترادف ہوتا۔ صدر ماؤ نے کہا "زمین کے مقابلے میں آدمیوں کا تحفظ کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے"۔ حملے سے پیشتر دشمن کے طیارے تقریباً دو ہفتے سے مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ سرخ فوج کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ دشمن کو اندر گھسنے کا موقع دیا جائے، اور جب وہ تھک جائے تو حرکت کے دوران اس پر کاری ضربیں لگائی جائیں۔

۱۸ مارچ کو شام کے چھ بجے سرخ فوج کے سپاہی ینان سے بیس لی دور چلے گئے۔ ۱۹ مارچ کو صبح کے وقت دشمن کی فوجوں نے ینان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد چاؤیوان میں ایک گوریلا دستہ متعین کیا گیا۔ اس دستے کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً دشمن کو ہراساں کرتا رہے۔

ہم پاکستانی خواتین کا خیر مقدم کریں گے

اس دستے نے صدر ماؤ کی وضع کردہ حکمتِ عملی "دشمن آگے بڑھتا ہے تو ہم پیچھے ہٹتے ہیں، دشمن تھک جاتا ہے تو ہم اس پر حملہ کرتے ہیں اور دشمن بھاگتا ہے تو ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں" کے تحت دشمن کا مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا، اور اس کے بے شمار سپاہیوں کا صفایا کر دیا۔

رات کے وقت وہ چاروں طرف بکھر کر زور زور سے چلاتے "آگے بڑھو، آگے بڑھو" اور اس کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلاتے رہتے، اور پھر چپکے سے پیچھے ہٹ جاتے۔ دشمن سمجھتا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ ان پر حملہ ہونے ہی والا ہے۔ دشمن کے سپاہی اتنے بدحواس ہو جاتے کہ رات رات بھر اندھا دھند گولیاں چلاتے رہتے۔ گوریلا دستہ انہیں اس طرح مسلسل چار دن تک ہراساں کرتا رہا۔ پانچویں دن جبکہ دشمن پر ان کا خوف بیٹھ چکا تھا، انہوں نے اس کی ایک پلاٹون پر حملہ کر کے اس کا صفایا کر دیا۔

دوسرے روز دشمن نے ان پر بڑے پیمانے پر حملہ کر دیا۔ پہلے گوریلا دستہ سو سو کی ٹکڑیوں میں منقسم تھا۔ اب انھیں تیس تیس کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دشمن آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گوریلا دستے کی ان ٹکڑیوں نے قدم قدم پر اس کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دیں، اور وہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود تین دن کے اندر صرف دس لی تک پیش قدمی کر سکا۔ چوتھے دن انھوں نے آس پاس کے گوریلا یونٹوں کے اشتراک سے دشمن پر ایک زبردست حملہ کیا اور اسے ینان سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں گوریلوں نے دشمن کے بے شمار سپاہیوں کو گرفتار کیا۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس دو سو راؤنڈ گولیاں، دو دستی بم اور دو دور مار گولیاں تھیں، جو سب کی سب گوریلوں کے قبضے میں آ گئیں۔ ان دور مار گولیوں کو وہ دستی بم کے طور پر بھی استعمال کر سکتے تھے۔ یہ بات انھیں قیدی فوجیوں سے معلوم ہوئی، ورنہ یہ دور مار گولیاں ان کے لئے بالکل نئی چیز تھیں۔

گوریلوں نے قیدی فوجیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ ان سے بھائیوں جیسا سلوک کرتے تھے، اور انہیں کبھی مطعون نہیں کرتے تھے۔ وہ انہیں سیاسی تعلیم بھی دیتے تھے، اس کے بعد وہ ان قیدیوں کو رہا کر دیتے تھے۔ بہت سے سپاہی ان کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر واپس جانے سے انکار کر دیتے تھے۔ اور ان کے ساتھ رہ کر حملہ آوروں کے خلاف لڑنے کو ترجیح دیتے تھے۔ پہلے ان کے ذہن میں منفی پروپیگنڈے کا بہت اثر ہوتا تھا، لیکن جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ سرخ فوج کے سپاہی اور گوریلے ان سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتے، تو وہ ان کی عظمت کے معترف ہو جاتے جو قیدی واپس جانا چاہتے تھے، انہیں زادِ راہ اور سفر خرچ بھی دیا جاتا تھا، تاکہ انھیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایسے قیدی واپس جاتے وقت بہت شرمندگی کا اظہار کرتے کہ اگر ہمارے بال بچے ہمارا انتظار نہ کر رہے ہوتے تو ہم آپ جیسے مہربان اور فراخدل دوستوں کو چھوڑنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتے۔

اس شکست کے بعد دشمن نے ایک بار پھر وسیع پیمانے پر حملہ کر دیا، اور ایک بریگیڈ، ایک رجمنٹ، ایک آرٹیلری کمپنی اور دو طیاروں کے ذریعے دس لی تک آگے بڑھ آیا۔ اس کے ہوائی جہاز اوپر سے پیراشوٹ گرانے لگے۔ جب گوریلے دوڑ کر انھیں گھیرتے تو پتہ چلتا کہ وہ چھاتہ بردار نہیں ہیں۔ دشمن نے انہیں دھوکا دینے کے لئے چھتریوں سے گھاس کے پتلے باندھ دیئے تھے۔ معلوم نہیں اس میں اس کی کیا چال پوشیدہ تھی۔ دس لی تک بڑھنے کے بعد دشمن کو ایک انچ بھی آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ گوریلوں نے ان پر اس شدت سے حملہ کیا کہ

گوریلوں کا گذارہ باجرے پر ہوتا تھا

ان کی پیش قدمی رک گئی۔ اس صبح لے چی فو کے دستے کا ایک گوریلا شہید اور ایک زخمی ہو گیا۔

دوپہر کے وقت، ایک بجے کے قریب دشمن نے تین بڑے حملے کئے۔ گوریلا دستے نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس کے بہت سے سپاہیوں اور ایک کمانڈر کو ہلاک کر دیا۔ لیکن دشمن زور میں تھا، اس بار وہ اسے پسپا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسرے دن دشمن کے فوجی افسروں نے مقامی آبادی کے دو باشندوں کو پکڑ کر گوریلوں کے پاس بھیجا، اور ان سے کہا کہ ہتھیار ڈال دو، ورنہ تمہارا صفایا کر دیا جائے گا۔ دشمن نے انھیں یہ ترغیب بھی دی کہ اگر کوئی گوریلا اپنے ساتھ ایک رائفل لے کر آئے گا تو اسے پچاس یوان دیا جائے گا، اور اگر کوئی بٹالین کمانڈر آئے گا تو اسے کمپنی کمانڈر بنا دیا جائے گا۔

یہ سن کر گوریلوں کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے ان دونوں افراد کے ذریعے دشمن کے افسروں کو یہ پیغام بھیجا کہ "تم لوگ ہتھیار ڈال دو، ورنہ جب ہم تمہیں پکڑیں گے تو عوام کے حوالے کر دیں گے۔" یہ ایک پُراثر نفسیاتی حربہ تھا۔ دراصل دشمن کے سپاہی عوام سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ وہ جہاں کہیں جاتے، عوام کے گھر لوٹ لیتے تھے، اس لئے عوام ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اور انھیں معلوم تھا کہ اگر وہ عوام کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ان کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ عوام سرخ فوج کے سپاہیوں سے محبت کرتے تھے، اور کومنتانگ کے حملہ آور سپاہیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اس کے بعد کومنتانگ کی فوج آگے پیشقدمی نہ کر سکی، اور اسے واپس ینان کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ لیکن پسپا ہونے کے بعد بھی دشمن کے فوجی افسر گوریلا دستے کو پریشان کرنے کے بٹالینیں بھیجتے رہے۔ اس کے سپاہی ہر قدم پر اندھا دھند گولیاں چلاتے رہتے۔ موقع پا کر گوریلے ان پر حملہ کر دیتے۔ گوریلا دستے کو تیس تیس کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ ٹکڑیاں چاروں طرف سے دشمن کو پریشان کرتیں، اور جب موقع ملتا ان کا صفایا کر دیتیں۔ دشمن کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے بھی نئے طریقے اختیار کئے۔ اس نے چاؤ وان میں صرف ایک بریگیڈ متعین کیا اور پانچ لی کے فاصلے پر دو دیہات میں اپنے دو رجمنٹ متعین کئے، تاکہ وہ گوریلا دستے کو روکے رکھیں، اور انھیں آگے بڑھنے کا موقع نہ دیں۔

جب ان رجمنٹوں کے سپاہی گوریلوں کی تلاش میں نکلتے تو انہیں وادیوں اور میدانی علاقوں میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ پہاڑی راستوں کو ترجیح دیتے تھے۔ جب وہ باہر نکلتے تو اپنے چند آدمی بھیج کر گاؤں کے لوگوں کو لوٹ لیتے۔ جب گوریلا دستے کو ایسے واقعات کا علم ہوا تو اس نے اپنے آدمی، دس دس کی ٹکڑیوں میں قریبی دیہات میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ گوریلے وہاں چھپ کر گومنتانگ کے ڈاکوؤں کا انتظار کرتے، اور جب وہ وہاں پہنچتے تو ان کا صفایا کر دیتے۔ ایک دفعہ لے چی فو کے گروپ

”دشمن آگے بڑھتا تو ہم پیچھے ہٹتے ہیں، دشمن تھک جاتا ہے تو ہم اس پر حملہ کرتے ہیں!“

نے اسی ترکیب سے دشمن کے سات آدمی گرفتار کئے۔ وہ لوگ اس لڑائی یا جھڑپ کو ماچھوئے (گوریّا) کی لڑائی کہتے تھے۔

گوریلوں کو عوام کی پوری حمایت حاصل تھی۔ جب دشمن کے سپاہی آتے تھے تو لوگ ہوا میں مٹی اچھال کر انھیں سگنل دیتے اور وہ اپنی کمین گاہ سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑتے۔

مارچ سے مئی تک یہی حالت رہی۔ گاہے گاہے چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ جون سے دشمن کی فوجوں نے نیا طریقہ اختیار کیا، اس نے چاروں طرف تین تین بریگیڈ وں سے گوریلا دستوں کا محاصرہ کرلیا، اور انھیں تین سو لی کے گھیرے میں پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت گوریلوں کے پاس پہلے سے زیادہ اسلحہ تھا۔ پچھلی لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے دشمن کے سپاہیوں کے ہتھیار ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک دشمن کو روکے رکھیں، تاکہ اس دوران اصل فوج پوری تیاری کے ساتھ ان پر حملہ کرسکے۔ اگر یہ گوریلا دستے تین ماہ تک دشمن کی فوجوں کو روکے رکھتے تو ان کی باقاعدہ افواج کو تیاری کا خاطر خواہ موقع مل جاتا۔ اتنی بڑی فوج کو اتنی کم تعداد سے روکے رکھنا بہت مشکل کام تھا۔ مغرب کی طرف گھنے، وسیع جنگلات تھے۔ دن کے وقت گوریلا دستے اس کے اندر چھپ جاتے، اور رات کو نکل کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر دشمن پر حملہ کرتے۔

جب دشمن کا کسی گاؤں پر قبضہ ہوتا تو وہ وہاں بوگس سیاسی انتظامی ادارہ قائم کردیتا، جسے عوام میں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ یہ انتظامی ادارہ دیہاتیوں پر بے پناہ ظلم ڈھاتا تھا اور انھیں اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ گوریلوں کو خوراک اور دوسری اشیاء فراہم نہ کریں۔ اس زمانے میں خوراک کی بڑی قلت تھی۔ سرخ فوج کے سپاہیوں کے علاوہ ان گوریلوں کا گزارہ بھی باجرہ پر ہوتا تھا۔ دشمن نے ناکہ بندی کی تمام ممکنہ تدابیر اختیار کی تھیں، اس کے باوجود عوام گوریلوں سے تعلق قائم رکھتے تھے اور انھیں ان کی ضروریات کی اشیاء فراہم کرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات مقامی بدمعاشوں کو گوریلوں کی سرگرمیوں اور ٹھکانوں کا علم ہوجاتا، اور وہ کومنتانگ کے افسروں کو مطلع کردیتے۔ ان بدمعاشوں کی وجہ سے گوریلوں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

گوریلے دن میں صرف دو بار، سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونیکے بعد، کھانا کھا سکتے تھے۔ اگر وہ دن کے اجالے میں پکاتے تو دھواں اٹھنے کی وجہ سے دشمن کو ان کے ٹھکانوں کا علم ہوجاتا۔ جب مقامی بدمعاشوں کی سرگرمیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو گوریلوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ انھوں نے اپنے آدمی بھیج کر انہیں متنبہ کیا کہ اگر وہ دشمن کے لئے جاسوسی کرتے رہے تو پہلی بار تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا، لیکن دوسری بار قتل کردیا جائے گا۔ اس دھمکی کے بعد مخبری کے واقعات کم ہوگئے۔

ایک ماہ اور اسی طرح چھوٹی موٹی جھڑپوں میں گزر گیا۔ گوریلا دستوں کے مقابلے میں دشمن کے سپاہیوں کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی فوج بہت بڑی تھی اور اتنی بڑی فوج کے لئے خوراک کی فراہمی بجائے خود ایک مسئلہ تھا۔ چند ہفتوں کے بعد ان کے راشن کی مقدار کم ہوگئی۔ سرخ فوج کے سپاہی تو خود بھوکے رہ لیتے تھے، لیکن عوام کی چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ لیکن یہ کومنتانگ کے سپاہی تھے جنہیں شروع سے ہی لوٹ مار کی تربیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اور بھی زیادہ بیدردی کے ساتھ عوام کو لوٹنا شروع کردیا۔ وہ کسانوں کے جانور پکڑ لیتے اور انھیں کاٹ کر کھا جاتے۔ ان کی اس لوٹ مار کا ردِ عمل یہ ہوا کہ عوام ان سے اور زیادہ نفرت کرنے لگے، اور دل و جان سے گوریلوں کی مدد کرنے لگے۔

دشمن کے سپاہیوں کو گرفتار کرنے کے بعد گوریلوں کو یہ مسئلہ درپیش ہوتا تھا کہ اگر انھیں چھوڑ دیا جائے گا تو وہ واپس جاکر ان کے ٹھکانے کا پتہ بتادیں گے۔ چنانچہ وہ انھیں پہاڑوں میں ادھر ادھر بھول بھلیوں میں گھماتے ہوئے، چکر لگا کر چھوڑ دیتے۔ اس کے باوجود اس بات کا امکان رہتا تھا، کہ انہیں راستہ یاد رہے گا۔ اور جب اس قسم کے دو تین واقعات پیش آئے تو وہ انہیں دو تین لی دور لے جاکر چھوڑتے۔ اور اگر چاندنی روشنی زیادہ ہوتی تو ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتے۔

لڑائی طول پکڑتی جارہی تھی اور دشمن دن بدن لاغر ہوتا جارہا تھا۔ اب اس کے سپاہیوں کو عوام سے بھی کوئی چیز نہیں ملتی تھی کیونکہ وہ ان کی آمد سے پہلے ہی اپنا تمام اناج اور قیمتی اشیاء چھپا دیتے تھے۔ دشمن کے سپاہیوں کو جنگل کے موٹے پاتوں پر روٹی پکانی پڑتی تھی۔ کچا پکا کھانا کھاکر وہ بیمار ہوجاتے۔ چونکہ ہم قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے تھے اور گرفتار



جنگِ مزاحمت کے دوران صدر ماؤ اور مارشل چوتیہہ کسی اہم مسئلے پر تبادلۂ خیال کررہے ہیں۔

کرنے کے بعد انہیں ہلاک نہیں کرتے تھے، اس لئے وہ بڑی بے دلی سے گوریلوں کا مقابلہ کرتے تھے، اور سامنے آکر فوراً دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ انھیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ پھر ان کے پاس خوراک کی بھی قلت تھی، یہ خیال ان کے لئے امید افزا ہوتا تھا کہ گرفتار ہونے کے بعد انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہوگی۔ انہیں طیاروں کے ذریعے خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ جب ان کے طیارے اوپر سے خوراک کے ڈبے اور پیکٹ پھینکتے تھے تو ان میں سے کچھ ڈبے گوریلوں کے ہاتھ بھی لگ جاتے تھے۔

ان تمام حالات سے مایوس ہوکر دشمن کی یہ فوج ینان واپس چلی گئی۔ انھوں نے ظلم کی انتہا کردی۔ ینان کے ارد گرد اسّی لی کے گھیرے میں رہنے والے تمام باشندوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ ینان لے گئی، تاکہ گوریلوں کو ان سے کھانے پینے کی کوئی چیز نہ مل سکے۔ لیکن دشمن کی اس حماقت نے خود اس کے لئے مشکل کھڑی کردی۔ جب اتنے آدمی ینان میں جمع ہوگئے تو ان کو خوراک مہیا کرنے کا مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کرنے لگا۔ وہ اپنے فوجی دستوں کو بھیج کر قرب و جوار کے علاقوں سے کھانے پینے کی چیزیں لوٹ لیتے۔ کیونکہ انھیں یہ ڈر ہوتا تھا کہ گوریلا دستے ان پر چھاپہ ماریں گے، اس لئے وہ مقامی باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ خود پیچھے رہتے تھے اور انھیں آگے رکھتے تھے، تاکہ اگر گوریلے حملہ کرنا چاہیں تو عوام کو دیکھ کر اپنا ارادہ ترک کردیں۔ لیکن گوریلوں نے ان کی چال کامیاب نہ ہونے دی۔ جب وہ لوٹ مار کرکے واپس جاتے تو عوام کی جماعت ان کے آگے ہوتی، اس طرح گوریلوں کو ان پر حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ جب وہ ان پر حملہ کرتے تو عوام ان کی قید سے بھاگ نکلتے۔ گوریلوں کی ان مؤثر کارروائیوں سے عوام میں ان کا وقار اور

دشمن، گوریلوں کے سر کاٹ کر درختوں پر لٹکا دیتے

بڑھ گیا۔ انھیں یہ احساس ہوگیا کہ گوریلا طاقتور ہیں اور دشمن کا پوری طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ عوام جوق در جوق گوریلا دستوں میں شامل ہونے لگے۔ لے چی فو کے دستے میں گوریلوں کی تعداد پانچ سو سے بڑھ کر ایک ہزار تک پہنچ گئی

جب کوئی گوریلا دشمن کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ تشہیر کے لئے اس کا سر کاٹ کر درخت پر لٹکا دیتے۔ اس سے عوام میں ان کے خلاف نفرت اور بڑھ گئی۔ جون، جولائی تک یہی حالت رہی۔ اگست، ستمبر، اکتوبر میں لے چی فو کے دستے کو ینان کے جنوب میں اسّی لی دور ایک شاہراہ کو کاٹنے کا فرض سونپا گیا، تاکہ دشمن کی رسد کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ ایک دفعہ اگست میں انہوں نے دشمن کی اسلحہ سے بھری ہوئی چار گاڑیوں پر حملہ کیا اور اس کے ساتھ چلنے والی ایک پلاٹون کا صفایا کر دیا۔ اس کے بعد ان کے پاس اسلحہ کی کمی نہیں رہی۔ اس واقعے کے بعد دشمن تحفظ کے لئے رینجر پلاٹون بھی روانہ کرنے لگا، لیکن گوریلوں نے رفتہ رفتہ اس کی اس پلاٹون کا بھی صفایا کر دیا۔

لے چی فو کے گوریلا دستے نے دشمن کے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے میں بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ دشمن کی ٹیلیفون لائنیں کاٹ دیتے۔ ایک رات انھوں نے چالیس لی کے فاصلے میں ٹیلیفون لائنوں کا صفایا کر دیا۔ ایک گوریلے نے ایک وقت میں بارہ جن (ایک جن = ایک پونڈ) تار کاٹا۔ خود لے چی فو نے ایک رات چودہ جن تار کاٹا۔ بعض لوگوں کی کارکردگی ان سے بھی زیادہ نمایاں رہی۔

ینان ایک سال، ایک ماہ اور تین دن تک دشمن کے قبضے میں رہا۔ اس دوران پورے شمالی شینسی میں اس کے ایک لاکھ سپاہیوں کا صفایا ہو گیا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۴۸ء کو سرخ افواج دوبارہ ینان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس سے صدر ماؤ کے اس مقولے کی تصدیق ہو گئی کہ "زمین کے مقابلے میں آدمیوں کا تحفظ زیادہ ضروری ہے!"

اس جنگ کے دوران لے چی فو کے بریگیڈ میں کل ۲۴ گھرانے آباد تھے، جن کے گیارہ افراد گوریلا دستے میں شریک تھے۔ ان میں سے صرف ایک فرد شہید اور ایک زخمی ہوا۔

اس لڑائی کے دوران اصل فوج کے رہنما کارکن گوریلا دستوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ وہ ان کی ضروریات معلوم کرتے رہتے تھے اور حتی المقدور ان کی مدد کرتے تھے۔ جب وہ بتاتے تھے کہ صدر ماؤ شمالی شینسی ہی میں ہیں تو گوریلوں کے حوصلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ لڑائی میں فتح کے بعد رہنما کارکن ان کے پاس جاتے تھے اور انہیں پھولوں کے ہار پہناتے تھے۔

گوریلا دستے کے اراکین اپنے تجربات کی تلخیص کرتے رہتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی، دشمن کے خلاف چار چار یا پانچ پانچ گنا قوت بھی استعمال کرتے۔ سرخ فوج کے سپاہیوں کی طرح وہ بھی آٹھ تنظیمی اصولوں پر عمل کرتے تھے، اور عوام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ وہ صدر ماؤ کے اس اصول کے تحت کہ "اصل آہنی دیوار عوام ہیں"! کھیتی باڑی کے سلسلے میں بھی عوام کی مدد کرتے تھے۔

اس وقت پورے ینان میں گوریلوں کے چار دستے تھے، جو دو ہزار افراد پر مشتمل تھے۔ اس کے علاوہ ہر کاؤنٹی میں الگ الگ گوریلا دستے بھی موجود تھے۔ اپریل ۴۸ء میں دشمن ینان سے فرار ہو گیا۔ ۲۲ اپریل ۴۸ء کو ینان کے باشندے ایک بار پھر شہر سے باہر نکل کر سرخ فوج کے سپاہیوں کا استقبال کر رہے تھے۔

لے چی فو اس وقت ینان کاؤنٹی کی انقلابی کمیٹی اور ینان ڈویژن پارٹی کمیٹی کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شہر کی انقلابی کمیٹی کی مجلسِ قائمہ میں بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی بریگیڈ کی پارٹی برانچ کے سیکرٹری اور اپنے کمیون کی انقلابی کمیٹی کے صدر ہیں۔ وہ ینان کے باشندوں کے نمائندے کی حیثیت سے نویں کانگریس میں حصہ لے چکے ہیں۔

جب میں لے چی فو سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہماری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی دوست ہمارے پاس آئیں۔ ہم گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اب تک کوئی پاکستانی خاتون یہاں نہیں آئیں۔ حالانکہ دوسرے ممالک کی خواتین بڑی تعداد میں یہاں آتی ہیں۔ ہمیں پاکستانی خواتین سے مل کر بہت خوشی ہوگی"!

ایک اداس درخت کی کہانی

خلش مظفر

وہ لفظ جس کے اُجالے کی رُونمائی کے وقت
ہمارے پالنے والوں کے گرم جسموں سے
لہو نچوڑا گیا تھا بنامِ آزادی
اُس ایک لفظ کا بانی بڑے سکون کے ساتھ
زمیں کی گود میں سویا ہوا ہے برسوں سے

اُسے خبر ہی نہیں ہے کہ اُسکے ہاتھوں نے
جو اِک درخت لگایا تھا اس کی شاخوں پر
تعصّبات کے عفریت کا بسیرا ہے

میں سوچتا ہوں کبھی اُس کے شہر میں جاکر
سُلگتے کانپتے ہونٹوں سے یہ بتاؤں اُسے
جو لفظ تو نے بنایا تھا اُس کی دھرتی پر
رفاقتوں کے جو پودے لگائے جاتے ہیں
جوان ہونے سے پہلے جلائے جاتے ہیں

اُسے بتاؤں کہ اُس کے درخت سے مجھ کو
نہ کوئی پھول ملا ہے نہ کوئی پھل ہی مِلا
مہکتے جھومتے خوشوں کی سُرخ دھرتی سے
مجھے اناج کے بدلے میں صرف ہل ہی ملا

زمین داروں کی گلیوں کو جگمگا کر بھی!
مرے مکان میں جلتے رہے دُکھوں کے چراغ
مرے وجود کی شاخوں کو فِکر چاٹ گئی
مری قبا کے مقدّر سے گرد لپٹی رہی
مری وفا کو چڑھایا گیا صلیبوں پر
مرے خلوص کی گردن میں طوق ڈال دیئے
میں مرگیا تو کفن بھی نہیں ملا مجھ کو

خموش قبر کے دامن میں سونے والے بتا
ملوں گا چہرے پہ کب تک میں ظلم و جبر کی ریت
یہی وفا کا صلہ ہے تو روزِ محشر تک
نہ کوئی فصل پکے گی نہ لہلہائیں گے کھیت

روزنامہ "سن" کے محنت کشوں کی جدوجہد



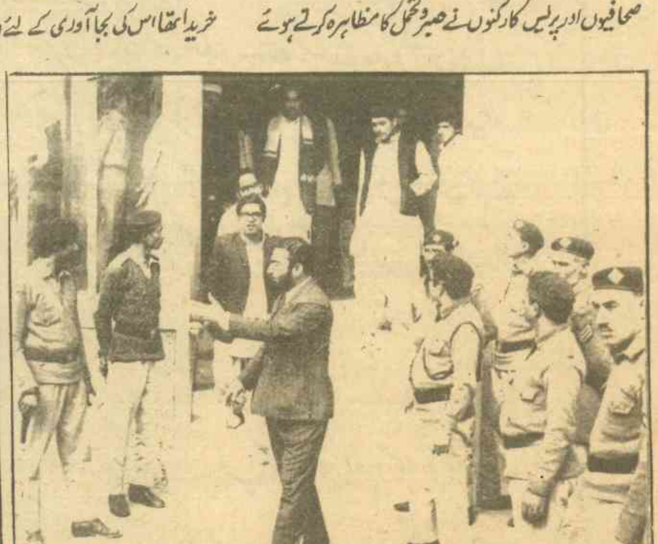
انتظامیہ کے کارندے

"سن" کے محسن "سن" سے نکال دیئے گئے

۱۶ر دسمبر ۷۲ء کو انگریزی اخبار سن کی انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے خلاف تمام اخبارات میں ۱۱ بجے سے ایک بجے تک دو گھنٹے کی علامتی ہڑتال تھی۔ چند روز پیشتر سن کی انتظامیہ انتقامی کارروائی میں اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ سن پبلی کیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین کے صدر اور انجمن صحافیان کراچی کے رکن علیم الدین پٹھان، نائب صدر انتظار حسین اور جنرل سیکرٹری الطاف حسین بھٹی کو جھوٹے الزام کے تحت گرفتار کرا دیا گیا۔ اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر عام اخلاقی مجرموں کی طرح انہیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس واقعہ سے پریس ورکروں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے قبل اخبار سن میں یونین کے سرگرم کارکنوں کو بے بنیاد اور من گھڑت الزامات کے تحت انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا، جس کے جواب میں صحافیوں اور پریس کارکنوں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے یونین کی سرگرمیاں جاری رکھیں، اور اپنے اتحاد اور نظم و ضبط کو برقرار رکھا، انتظامیہ نے جب دیکھا کہ اس سے بات نہیں بنتی تو یونین کے تین عہدیداروں کو جھوٹے الزام میں گرفتار کروا دیا۔ اور دو روز کے بعد انہیں ضمانت پر رہا کیا گیا۔

روزنامہ سن کے ایڈیٹر شمیم احمد نے ایک روز قبل علیم الدین پٹھان کو دھمکی دی کہ اگر ہڑتال کی تو تمہاری لاش ملے گی۔ "سن میں ہڑتال کرنے والے دوسرے دن دفتر میں نہ آئے"۔ ۱۶ر دسمبر کو جب سن پبلی کیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین کے کارکن اور انجمن صحافیان کے عہدیدار روزنامہ سن کے دفتر میں احتجاجی میٹنگ کرنے پہنچے تو وہاں ان کے سواگت کے لئے پہلے سے تیس پینتیس کرائے کے غنڈے موجود تھے۔ چہروں پر وحشت ہاتھوں میں ڈنڈے اور پستول۔ انتظامیہ نے جس مقصد کے لئے انہیں خریدا تھا اس کی بجا آوری کے لئے وہ پوری طرح تیار تھے بالائی منزل والی تمام سیڑھیوں پر غنڈے کھڑے ہوئے چیخ رہے تھے۔ "یہاں جلسہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اوپر آنے کی کوشش کی تو اسے جان سے مار دیا جائے گا۔"

ایک ڈھیل ڈول غنڈہ بار بار مٹھیاں بھینچ کر علیم الدین پٹھان پر ٹوٹ پڑتا لیکن کارکن درمیان میں آ جاتے۔ اور وہ اپنے قاتلانہ حملے کے منصوبے میں ناکام ہو جاتا۔ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر بھی اس جگہ موجود تھے اور نامعلوم افراد کی غنڈہ گردی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس جگہ موجود جب پولیس کو بتایا گیا کہ یہ سن کے ملازمین نہیں ہیں بلکہ کرائے کے غنڈے ہیں تو اخبار کے مدیر شمیم احمد نے کہا کہ یہ سن کے ملازمین ہیں۔" انتظامیہ نے سارے انتظامات پہلے سے مکمل کر لئے تھے۔ ایک روز قبل ان غنڈوں کو تقرری کے لیٹر جاری کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح غنڈہ گردی کو باقاعدہ تحفظ دیدیا گیا تھا۔ کرائے کے غنڈے



پولیس، علاقہ مجسٹریٹ جناب ممتاز بیگ کی نگرانی میں نامعلوم افراد کو باہر نکال رہی ہے



منہاج برنا سیکرٹری جنرل پی ایف یو جے اسمبلی کے پریس روم میں اخبار نویسوں سے مخاطب ہیں



بدین پٹھان کو روک رہے ہیں

"سن" کی انتظامیہ صوبائی حکومت کے لئے چیلنج بن گئی



نامعلوم افراد "سن" کے ملازمین پر آوازے کس رہے ہیں

کی دھونس دھمکی کے باوجود صحافیوں اور پریس ورکروں نے احتجاجی جلسہ کیا اور سن انتظامیہ پر یہ بات ظاہر کردی کہ وہ اپنا سر نہیں

صفائی کا موقع دیئے بغیر علیم الدّین پٹھان کو برطرف کردیا گیا

جھکائیں گے اور ہر قیمت پر حق و صداقت کا پرچم بلند رکھیں گے۔

بات کہاں سے شروع ہوتی ہے

ہم المحسن

یہ بات اپنی جگہ تلخ سہی، مگر ایک حقیقت ہے کہ لسانی ہنگاموں کے دوران کراچی کے بعض اخبارات نے انتہائی گھناؤنا کردار انجام دیا اور بھائی کو بھائی سے لڑانے کی مذموم سازش کی۔ ان اخبارات میں انگریزی کا روزنامہ "سن" بھی پیش پیش رہا۔ روزنامہ سن کا تنہا یہی ایک سیاہ کارنامہ نہیں ہے، بلکہ انڈس مائینز اور انڈس کیمیکلز کے سرمائے سے نکلنے والے اس سامراجی پریس نے فارموسا اور اسرائیل سے تجارتی تعلقات کے فوائد پر مضامین شائع کیے۔ تائیوان سے تجارت کی اہمیت پر تین مراسلے شائع کر کے اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا گیا کہ اس عوام دشمن اخبار کے ڈانڈے امریکی سامراج اور اس کے حواریوں سے ملے ہوئے ہیں۔



علیم الدین پٹھان احتجاجی اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں

"سن" بمقابلہ صوبائی حکومت

صوبائی اسمبلی کے رواں اجلاس کے دوران حزب اختلاف کی جانب سے روزنامہ سن کے ملازمین کے سلسلے میں تحریک التوا پیش کی گئی تھی۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء کے اجلاس میں تحریک التوا کے محرک ظہور الحسن بھوپالی نے کہا "وزیر اعلیٰ نے ایوان کو یقین دلایا ہے کہ "سن" کا مسئلہ حل کر دیا جائے گا اور وزیر محنت اور مالکان کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے لہٰذا میں اپنی قرارداد واپس لیتا ہوں"، اس بات کو چند سیکنڈ ہوئے تھے کہ وزیر اعلیٰ نے ایوان میں اعلان کیا کہ "سن کا مسئلہ حل ہو گیا ہے"، لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سن کی انتظامیہ نے ابھی تک برطرف شدہ ملازمین کی بحالی اور دیگر مطالبات منظور نہیں کئے ہیں۔ جس سے سن کے ملازمین اور دیگر اخبارات و نیوز ایجنسیوں کے ملازمین میں سخت بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ سن کی انتظامیہ آخر کس طاقت کے اشارے پر صوبائی حکومت کے اختیارات کو چیلنج کر رہی ہے۔

سن کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا گیا

۱۷ر جولائی کو مرکزی حکومت نے روزنامہ سن کا ڈیکلریشن ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت منسوخ کردیا۔ الزام عائد کیا گیا تھا کہ روزنامہ سن نے "لسانی آرڈیننس نافذ ہوگیا" کے عنوان سے ایک ایسی خبر سنسر کرائے بغیر شائع کی جس سے دو طبقوں کے درمیان صوبائی تعصب اور نفرت پیدا ہوتی تھی۔ حکومت کے اس اقدام سے روزنامہ سن بند ہوگیا اور اس میں کام کرنے والے صحافی اور پریس ورکر بیروزگار ہوگئے۔ وفاقی انجمن صحافیان پاکستان اور انجمن صحافیان کراچی کا یہ موقف تھا کہ اخبار بند کرنے کی بجائے اس پر عام عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا اگر الزام درست ثابت ہوتا تو اس کی سزا دی جاتی۔ اس کے برعکس حکومت نے اخبار بند کر کے سینکڑوں افراد کو بے روزگار کردیا، اور ان پر ناکردہ گناہ کی سزا مسلط کردی گئی۔

چنانچہ وفاقی انجمن صحافیان پاکستان کے پرچم تلے روزنامہ سن اور دیگر اخبارات اور نیوز ایجنسیوں سے تعلق رکھنے والے صحافیوں اور پریس ورکروں نے حکومت کے غلط اقدام کیخلاف اور ڈیکلریشن کی بحالی کی جدوجہد شروع کی جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ اس دوران روزنامہ سن کے بیروزگار صحافیوں اور پریس ورکروں پر مشتمل ایکشن کمیٹی بھی بنا دی گئی۔ ایکشن کمیٹی اور انجمن صحافیان کراچی کے اشتراک و تعاون سے شروع کی جانے والی یہ جدوجہد





پولیس "سن" کی عمارت کے اندر ایک شخص کو باہر لیجا رہی ہے

'سن' کی عمارت میں بعض افراد نعرے لگا رہے ہیں

آزادی صحافت کی تاریخ کا ایک یادگار ورق ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ صحافیوں اور پریس ورکروں نے علامتی ہڑتالیں کیں، پکوڑے کی دکان لگائی، بھوک ہڑتال کی۔ کراچی پریس کلب کے علاوہ تمام اخبارات میں احتجاجی جلسے کئے۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ روزنامہ سن کا ڈیکلریشن بحال کرے۔ یہ طویل اور صبر آزما جدوجہد بالآخر رنگ لاکر رہی، حکومت نے ۱۳ اگست کو سن کا ڈیکلریشن بحال کر دیا۔

۱۳ اگست کی رات کا واقعہ

روزنامہ سن کے ڈیکلریشن کی بحالی صحافیوں کی زبردست کامیابی تھی۔ ادھر کراچی کے صحافی اور پریس ورکرز جدوجہد کی کٹھن راہوں سے گزر رہے تھے۔ ادھر اخبارات کے مالکان اور مدیر گلچھرے اڑانے میں مصروف تھے۔ مدیر شمیم احمد بار بار کہتے "ہمارا کیا جاتا ہے، ہم تو مزے میں ہیں، مرنے والے مریں گے"۔ ڈیکلریشن کی بحالی کی خبر سن کر سن کے بے روزگار صحافی اور دیگر کارکن خوش خوش اپنے دفتر میں پہنچ گئے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ ایڈیٹر اور دوسرے دو افراد اسلام آباد میں تھے۔ وہ رات کی فلائٹ سے دفتر پہنچے، دیکھا تو کارکنوں نے پہلا اور آخری صفحہ چھوڑ کر اندر کے تمام صفحات تیار کر لئے تھے۔ یہ بات سخت ناگوار گزری۔ انہیں شاید پہلی بار اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ ان کے بغیر بھی اخبار تیار ہو سکتا ہے۔ کارکنوں کی مشترکہ جدوجہد کے سامنے وہ بونے بن گئے تھے۔ چنانچہ وہ پیشانی پر شکنیں سمیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ ــــ دندناتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلے اور پوری قوت سے چلا کر کہا۔

"میرے کمرے کی لائٹ کس نے جلائی"۔

کسی نے کہا۔ "اگر کسی نے جلائی ہے تو چلئے معاف کر دیں"۔

شمیم احمد نے مزید گلہ پھاڑ کر کہا۔ "ہرگز نہیں ــــ کل اخبار نہیں نکلے گا علیم الدین پٹھان نے جواب دیا۔" جناب کل ۱۴ اگست ہے، اخبار تو تقریباً تیار ہو چکا ہے۔ معمولی سی بات پر اتنی کڑی سزا نہ دیں۔" "خاموش رہو خاموش رہو"۔ انہوں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کل اخبار نہیں نکلے گا۔ میں نے ویٹو کر دیا۔ اور تم لوگ کان کھول کر سن لو، اخبار کے ڈیکلریشن کی بحالی میں تم لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کوششوں سے ڈیکلریشن بحال کروایا ہے۔ سمجھ گئے" ــــ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اور دھڑام سے دروازہ بند کر لیا۔ سن کے کارکن ہکا بکا ایڈیٹر صاحب کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

سن پبلی کیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین کی بنیاد

روزنامہ سن کے ڈیکلریشن کی منسوخی اور بحالی کے دوران ایکشن کمیٹی کام کرتی رہی تھی۔ اس کی مدت دو اگست سے ۱۳ اگست ۱۹۷۲ء ہے۔ ڈیکلریشن کی بحالی کے بعد سن کے ملازمین نے صحافیوں، پریس ورکروں اور دیگر کارکنوں پر مشتمل سن پبلی کیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات انتظامیہ اور ایڈیٹر کو انتہائی ناگوار گزری تھی۔ وہ روزنامہ سن میں یونین سرگرمیوں کے سخت خلاف تھے۔ اور در پردہ ان لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ بنا رہے تھے جو ایکشن کمیٹی اور اس کے بعد یونین بنانے میں پیش پیش تھے۔ اصحاب نقوی اور اصغر رضوی جیسے لوگوں نے اندرونی طور پر انتظامیہ سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اور اس کی یونین دشمن سرگرمیوں میں برابر کے شریک رہے۔ ۲۰ اگست کو سن پبلی کیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین بن گئی۔ اس کے ساتھ ہی انتظامیہ نے سرگرم کارکنوں کو چن چن کر اپنے انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

مدیر کے ترکش کے زہریلے تیر

یونین کے صدر علیم الدین پٹھان نے سن کے ملازمین کے سلسلے میں مینجنگ ڈائریکٹر جناب پرویز لاری سے ملاقات کی اور ان سے



پولیس سن ورکرز یونین کے اجلاس میں مداخلت کرنے والے ایک شخص کو باہر نکال رہی ہے



نامعلوم افراد علیم الدین پٹھان کو "سن" کے دفتر میں داخل ہونے سے روک رہے ہیں

"کل اخبار نہیں نکلے گا، میں نے ویٹو کر دیا ہے"

تبادلہ خیال کیا۔ یہ خبر جب ایڈیٹر صاحب کو پہنچی تو وہ چراغ پا ہو گئے۔ انہوں نے علیم الدین پٹھان کو بلا کر ڈانٹ پلائی کہ مجھ سے پوچھے بغیر تم نے مینیجنگ ڈائریکٹر سے کیوں بات چیت کی۔ آئندہ تم ان سے نہیں ملو گے۔" دوسرے دن ایک سرکلر جاری کیا گیا جس میں ایڈیٹوریل کے عملے کو حکم دیا گیا کہ وہ آئندہ سے مینیجنگ ڈائریکٹر سے پیشگی اجازت کے بغیر نہیں ملیں گے۔ علیم الدین پٹھان نے مزاحمت کی اور عملے کو خطرات سے آگاہ کیا۔ اصحاب نقوی سرکلر پر ایڈیٹوریل اسٹاف سے دستخط لیتے پھر رہے تھے۔ اس واقعہ کے چند دن بعد سن کے رپورٹر اقبال جعفری پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے کہ پی آئی ڈی سے ان کے خلاف شکایت آئی ہے۔ اقبال جعفری نے انتظامیہ سے کہا کہ ان کے خلاف جو تحریری شکایت آئی ہے اُسے لکھ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کا جواب دے سکیں، ساتھ ہی انہوں نے ہر قسم کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایک الزام ثابت کر دیا جائے تو میں ملازمت سے استعفیٰ دے دوں گا۔ اقبال جعفری کے اس واضح مؤقف کے سامنے انتظامیہ کی سازش ڈھیر ہو گئی۔ البتہ ان سے اکریڈیشن کارڈ واپس لے لیا گیا۔ اور ان کی جگہ کسی دوسرے رپورٹر کو لگا دیا۔

ایک ماہ بعد یعنی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو فصیح الدین سالار کو ملازمت سے برطرفی کا نوٹس دے دیا گیا۔ اس پر ملازمین نے ۲۵ ستمبر ۱۹۷۲ء کو علامتی ہڑتال کر دی۔ اور انتظامیہ کو مجبور کیا کہ برطرفی کا نوٹس واپس لے۔ فصیح الدین چھٹی پر چلے گئے۔ چھٹی ختم ہونے کے بعد انتظامیہ نے انہیں دوبارہ ڈیوٹی پر لینے سے انکار کر دیا۔ اور ان کی تنخواہ بھی روک لی۔ اس کے ساتھ ہی انتقامی کارروائیوں کا طویل سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ کارکنوں کے اوقاتِ کار تیزی سے تبدیل کئے جانے لگے اور ان سے زیادہ کام لینا شروع کر دیا گیا۔ اسٹاف میں سے جس شخص نے انتظامیہ کے خلاف آواز بلند کی اُسے معطلی اور برطرفی کا نوٹس جاری کر دیا گیا۔ فصیح الدین سالار کے بعد ٹیلیفون آپریٹر ماجد یامین اور یونین کے نائب صدر انتظار حسین کو نوٹس بورڈ پر علامتی ہڑتال کے نوٹس لگانے کے الزام میں معطل کر دیا گیا۔ یونین کے صدر علیم الدین پٹھان انتظامیہ کی آنکھوں میں بہت دیر سے کھٹک رہے تھے چنانچہ انہیں پہلے معطل کیا گیا اور اس کے بعد برطرف کر دیا گیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ایڈیٹر سے بدسلوکی کی تھی۔ حالانکہ یہ الزام بالکل بے بنیاد تھا۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے انتظامیہ نے ایک ایسی کمیٹی بنائی جس کا سربراہ اصغر رضوی کو مقرر کیا گیا۔ یہ مسلّم اصول ہے کہ کسی معاملے کی تحقیقات کے لئے کمیٹی کے ارکان اور سربراہ غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ لیکن سن کی انتظامیہ نے اس اصول کو بھی نظر انداز کیا اور کمیٹی کا کام اصغر رضوی کے سپرد کیا گیا جو انتظامیہ کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ۱۶ دسمبر کو انہیں معطل کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش ہوں۔ اس دوران علیم الدین بیمار ہو گئے۔ انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر کے چھٹی لے لی۔ ۱۳ دسمبر کو ان کے گھر پر برطرفی کا نوٹس بھیج دیا گیا۔ یونین کے صدر علیم الدین پٹھان کے معاملے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کی عدم موجودگی میں کمیٹی نے ان کے خلاف فیصلہ دیدیا کہ ان پر لگائے گئے الزامات درست ہیں۔

کرائے کے غنڈوں کی بھرتی

سن کی انتظامیہ نے ملازمین کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کرائے کے غنڈے اکٹھے کر رکھے ہیں۔ جو ہر وقت ہتھیاروں سے لیس رہتے ہیں۔ یہ غنڈے ملازمین کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی جائز اور قانونی ٹریڈ یونین



منہاج برنا سیکرٹری جنرل پی ایف یو جے، ایک احتجاجی اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں

سرگرمیاں ترک کر دیں۔ یہ غنڈے سن کے دفتر میں بھی موجود ہوتے ہیں اور بمبئی ہوٹل میں مقیم ہوتے ہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے، دفتر کے سامنے سن کے استقبالیہ اور پریس کے گیٹ پر منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کام ہے کہ وہ یونین کے عہدیداروں اور دوسرے کارکنوں کو گالیاں دیں، خوفزدہ کریں۔ وہ گلے پھاڑ کر کہتے ہیں کہ ان کا کام یونین کے سرپھروں کو ٹھیک کرنا ہے۔ نشے کے عالم میں بعض اوقات وہ چاقو کھول کر کسی عہدیدار کے پیچھے لپک پڑتے ہیں۔

۲۴ر ستمبر ۱۹۷۲ء کو یونین کے نائب صدر انتظار حسین کو غنڈوں نے گھیر لیا۔ انہیں اپنی جان بچانے کے لئے تین گھنٹے تک ایک کمرے میں بند ہونا پڑا۔ علیم الدین پٹھان کو انجمن صحافیان کراچی کے سینئر نائب صدر جناب ظفر رضوی اور دوسرے چند لوگوں نے اپنی حفاظت میں دفتر پہنچایا۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۷۲ء کی رات کو ان غنڈوں نے علیم الدین پٹھان کا دفتر سے لے کر پریس کلب تک تعاقب کیا۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آسکے۔ اس سے قبل سن کے سیکورٹی افسر نے مبینہ طور پر علیم الدین پٹھان پر چاقو سے حملہ کیا۔

یہ غنڈے عام طور پر یونین کے عہدیداروں کی گاڑیوں کے پہیوں سے ہوا نکال دیتے ہیں۔ گالیاں بکتے ہیں، اور اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ اور موقع ملتے ہی چاقو لہراتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں۔ غرضیکہ سن کے مزدوروں کو تنگ کرنے کے لئے انتظامیہ ایسے گھناؤنے ہتھکنڈوں سے بھی باز نہیں آتی جو اس مہذب دنیا میں باعثِ شرم ہیں۔ ملازمین کی تنخواہ روک لینا، ان کی ڈیوٹی کے اوقات میں تبدیلی اور سالانہ ترقی روک لینا معمول بن گیا ہے۔ پچھلے ایک ماہ کے دوران تقریباً بارہ تیرہ افراد کو جواب طلبی اور معطلی کے نوٹس جاری کئے گئے۔

روزنامہ سن میں ایک اور گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ایڈیٹر اور بعض سینئر صحافی کی مدد سے جن میں اصحاب نقوی اور اصغر رضوی جیسے نام نہاد ترقی پسند صحافی شامل ہیں۔ انتظامیہ نے صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے ایک بغل بچہ تنظیم قائم کر لی ہے۔ لیکن انتظامیہ کو اس سلسلے میں ابھی تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ملازمین کی اکثریت بغل بچہ یونین سے سخت متنفر ہے۔

انتظامیہ نے صوبائی وزیرِ محنت کو

ثالث بنانے سے انکار کر دیا

سن انتظامیہ کی انتقامی کارروائیوں کے خلاف کراچی کے صحافیوں نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو دو گھنٹے کی علامتی ہڑتال کی۔ اس روز صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وقفے کے دوران پی ایف یو جے کے سیکریٹری جنرل جناب منہاج برنا نے وزیرِ اعلیٰ سندھ جناب ممتاز بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں روزنامہ سن کے مسائل سے آگاہ کیا۔ وزیرِ اعلیٰ نے اس معاملے کو صوبائی وزیرِ محنت جناب ستار گبول کے سپرد کر دیا۔ اور اس بات کی ہدایت کر دی کہ اس کو معاملے کو جلد از جلد نمٹایا جائے۔ صوبائی اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی کور کرنے والے موجود صحافیوں نے علامتی ہڑتال کے دوران اسمبلی کی کارروائی کا بائیکاٹ بھی کیا۔

دوسرے دن صوبائی وزیرِ محنت کے دفتر میں فریقین کے نمائندے جمع ہوئے۔ سن انتظامیہ کی طرف سے اخبار کے مدیر اور ان کے قانونی مشیر موجود تھے جب کہ سن کے کارکنوں کی طرف سے پی ایف یو جے کے سیکریٹری جنرل جناب منہاج برنا اور سن پبلیکیشنز ورکرز یونین کے صدر مسٹر علیم الدین پٹھان تھے۔ صوبائی وزیرِ محنت نے فریقین کی باتیں سننے کے بعد کہا۔"

انتظامیہ نے تائیوان اور اسرائیل سے تجارتی تعلقات کے فوائد پر مضامین شائع کئے

جو کچھ ہو گیا، اسے جانے دیں، اب معاملہ ختم کریں" علیم الدین نے بھی کہا کہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر اس دوران مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معافی مانگنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ صوبائی وزیرِ محنت نے ایک بار پھر کہا۔ معاملہ ختم ہونا چاہیئے۔ جس کے جواب میں انتظامیہ کے نمائندے نے کہا "نہیں۔ کورٹ میں جاؤں گا۔ اگر کورٹ میں یہ لوگ جیت گئے تو میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔"

صوبائی وزیرِ محنت نے انتظامیہ کے نمائندے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ بلاوجہ تلخی بڑھے گی۔ جن لوگوں کو برطرف کیا گیا ہے انہیں واپس لے لیا جائے۔ انتظامیہ کے نمائندے نے جواب دیا "علیم الدین کو ہرگز واپس نہیں لوں گا۔" چنانچہ پہلی نشست کی بات چیت بار آور ثابت نہیں ہوئی۔

دوسرے دن بھی انتظامیہ کا نمائندہ ڈھٹائی سے اس پہ اڑا رہا کہ یونین کے صدر علیم الدین پٹھان کو واپس نہیں لیا جائے گا۔ گفتگو کے دوران انتظامیہ کے نمائندے نے ایک دوسری شرط لگا دی کہ کسی ریٹائرڈ جج سے معاملے کی تحقیقات کرائی جائے۔ جس کا مقصد اس معاملے کو طول دینا تھا۔ صوبائی وزیرِ محنت نے کہا کہ "اس بات میں وقت لگ جائے گا۔ اس تنازعہ کو فراخدلی سے بات چیت کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔" پی ایف یو جے اور یونین کے نمائندے وزیرِ محنت کی پیشکش قبول کرتے ہوئے انہیں ثالث بنانے پر تیار ہو گئے، لیکن انتظامیہ کے نمائندے نے وزیرِ محنت کو ثالث بنانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ سیاسی لیڈر ہیں۔ میں انہیں بطورِ ثالث قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ صوبائی وزیر نے ایک بار پھر انتظامیہ کے نمائندے کو سمجھانے کی کوشش کی جس کے جواب میں کہا گیا کہ علیم الدین مار دھاڑ کرے گا، صوبائی وزیر نے کہا کہ میں خود ان کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس کے باوجود وہ انتظامیہ کا نمائندہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور اس نے صوبائی وزیرِ محنت کی تمام اپیلوں اور درخواستوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

روزنامہ سن کی انتظامیہ اور ملازمین کے باہمی تنازعہ کا تاحال کوئی مثبت حل برآمد نہیں ہوا۔ خیال تھا کہ صوبائی حکومت کی مداخلت سے یہ معاملہ سلجھ جائے گا، مگر سن کی انتظامیہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ اور وہ ملازمین کے معاشی قتلِ عام سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نظر نہیں آتی۔ سن پبلیکیشنز لمیٹڈ ورکرز یونین نے مندرجہ ذیل مطالبات پورے ہونے تک اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔

(۱) ویج بورڈ ایوارڈ مکمل طور پر عمل میں لایا جائے۔
(۲) تمام مزدور قوانین عمل میں لائے جائیں۔
(۳) سن کے ملازمین کے تمام مطالبات تسلیم کئے جائیں۔
(۴) برطرف ملازمین کو بحال کیا جائے۔
(۵) جواب طلبی، معطلی، برطرفی کے نوٹس واپس لئے جائیں اور انکوائریاں ختم کرائی جائیں۔
(۶) کرائے کے غنڈوں کو ہٹایا جائے۔
(۷) جن کی تنخواہیں روک لی گئی ہیں انہیں ادا کی جائیں۔

یہ تو سن انتظامیہ کی دھاندلی، ہٹ دھرمی اور استحصالی رویے کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ پرائیویٹ ہے زیادہ تاریک اور گھناؤنا۔ قلم کانپتا ہے۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، اگر یہ کمزوریاں اخلاقی بیماری کی طرح پھلنے پھولنے لگیں تو علاج ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر پھوڑا دوا دارو سے اچھا نہ ہو تو گہرے نشتر لگانے پڑتے ہیں۔

بُجھتا چراغ

علمدار حیدر رضوی

ڈھولک کی تھاپ پر عورتوں کے گانے کی آواز رات کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ بوڑھا احمد اپنی جھونپڑی میں جلتے دیئے کی طرف دیکھ رہا تھا جو ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے بار بار تھرتھرا رہا تھا جیسے خود اس کی زندگی کا دیا کسی لمحے بجھنا ہی چاہتا ہو۔ ڈھولک کی مدھم لے پر گائے جانے والا گیت اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے خوشی کے بجائے کوئی بہت ہی غم انگیز گیت ہو۔ یہ غم اور خوشی کا امتزاج اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ کیوں کہ اس کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کہ لوگوں کے سامنے وہ ہنستا تھا لیکن اندر اندر اس کا دل روتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے سکھ کا خواہاں تھا لیکن اس کی اپنی زندگی مصائب جھیلتے ہی گزری تھی۔ اس نے تمام عمر دوسروں کی خاطر دکھ اٹھا کر سکھ دینے کی کوشش کی۔ اس کا نظریہ تھا کہ انسان کو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جینا چاہیئے۔ وہ اس شمع کی مانند تھا جو رات کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے اپنے آپ کو ختم کر لیتی ہے۔

معاشرے کے سینکڑوں مصائب و ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیکن معذور ہونے کے باوجود اس کے سینے میں یہ عزم آج بھی جوان تھا کہ وہ ظلم و ناانصافی کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ جب وہ بستی کے لوگوں سے معاشرہ کی ناہمواریوں اور دکھوں کا تذکرہ کرتا تھا تو اس کی آواز میں ایسا سوز پیدا ہو جاتا جس سے تمام سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ وہ لوگوں کو زندہ رہنے کے طریقے بتاتا کہ اے لوگو ہمیشہ حق و انصاف کے لئے ظلم و استحصال کے خاتمے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھو، ایک نہ ایک دن فتح تمہاری ہوگی۔ اسے ایسے وقت میں وہ لمحات یاد آجاتے جب وہ مزدور تحریک کا ایک پُرجوش رکن تھا۔ مزدوروں کے جلسے میں ایسی پُراثر تقریریں کرتا تھا جسے سن کر مزدور طبقے میں ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی تمام زندگی مزدوروں کے حقوق کی جدوجہد میں گزری تھی۔ اس نے مزدوروں کی بھلائی کے لئے کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اسے کئی بار جیل جانا پڑا۔ پولیس کی مار کھائی لیکن کوئی مخالف قوت اسے اپنے نظریہ سے نہ ہٹا سکی۔ اس نے خاندان کو چھوڑ دیا۔ آرام و آسائش کی زندگی چھوڑ کر مزدوروں کی بستی میں آگیا اور یہیں اس کی زندگی کے قیمتی دن گزر گئے تھے۔ وہ اس بستی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب وہ معذور نہیں ہوا تھا تو بستی کے ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اس کے مسائل سنے اور ان کا حل بتائے۔ لیکن فالج نے اسے پلنگ تک محدود کر دیا تھا۔ بستی کے تمام لوگ دن بھر کی رپورٹ دیتے اور پوچھتے کہ آئندہ کیا کریں۔ گذشتہ ماہ سے مزدور اپنے مسائل کے حل کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے، لیکن سرمایہ داروں نے ماننے سے انکار کر دیا اور دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا تھا جس کی وجہ سے مزدوروں میں سخت اضطراب تھا۔ آج کی صورتِ حال ابھی تک پتہ نہیں تھی جس سے وہ بے چین تھا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہو۔ کیونکہ ابھی تک بستی کے مزدور ڈیوٹی سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ لوگ اس کی جھونپڑی میں گھبرائے ہوئے داخل ہوئے۔ "چاچا مزدوروں اور پولیس میں تصادم ہو گیا ہے۔ پولیس نے مزدوروں پر بے تحاشا گولیاں برسائیں۔ نہ جانے کتنے مزدور شہید ہو گئے۔ اور بہت سے مزدوروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن مزدور بھی مقابلہ کر رہے ہیں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اس نے دکھ سے سوچا کہ کب تک میرے وطن کے لوگوں کے حقوق پامال ہوتے رہیں گے۔ جب بھی مزدوروں نے اپنے حقوق مانگے۔ سرمایہ داروں کی حمایتی سرکار نے بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ اسے وہ دن یاد آگئے جب وہ جوان تھا۔ اس وقت بھی سرکار نے مزدوروں پر گولی چلائی تھی۔ اسے اور اس کے سینکڑوں ساتھیوں کو غیر ملکی ایجنٹ کا الزام لگا کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تھا، تو اس نے جج سے پوچھا "کیا کبھی فرسودہ قانون نے کسی سرمایہ دار کو بھی سزا دی ہے کیا کبھی تمہارے ہاتھوں سے کسی سرمایہ دار نے بھی دم توڑا ہے۔ اگر نہیں تو تمہارا قانون سب فراڈ ہے۔ سرمایہ داروں کا بنایا ہوا قانون محنت کشوں کو حقوق نہیں دلا سکتا انصاف نہیں دے سکتا، مجھے تمہارے انصاف کی ضرورت نہیں۔" ان تلخ حقائق کو بیان کرنے پر اس کی سزا بڑھا دی گئی تھی۔ آج بھی وہی اندھیر ہے جو کل تھا۔ کیا اسی طرح میرے محنت کشوں کا خون بہتا رہے گا۔ وہ بڑی اداسی سے سوچنے لگا نہیں وہ سورج ضرور نکلے گا جس کی کرنیں میرے وطن کے لوگوں کے لئے آزادی کا پیغام لائیں گی۔ وہ صبح ضرور آئے گی جو ظلم و استحصال کا خاتمہ کر دے گی۔ وہ دور ضرور آئے گا جب لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی کا یہ فرسودہ نظام دم توڑ دے گا۔ لیکن اس صبح کی خاطر نہ جانے ابھی کتنے لوگوں کو قربانی دینی پڑے گی۔ اس کے تصور میں وہ چہرے گھوم گئے جنہوں نے بھوک سے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا تھا جنھیں حادثوں نے ختم کر دیا تھا جو زندہ رہ گئے تھے انھیں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔

کیا میرے وطن کے محنت کش یونہی مرتے رہیں گے۔ اس کے دل میں یہ خواہش شدت سے ابھری کہ کاش میں بھی اپنے دوستوں کے لئے کچھ کر سکتا۔ کاش میں پھل ہوتا جسے توڑ کر میرے وطن کی بیٹی اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر عصمت نہ بیچتی۔ کاش میں ایک پرندہ ہوتا جسے شکار کر کے میرے وطن کا نوجوان اپنے ناتواں جسم کو توانا کر سکتا۔

اے کاش میں طوفان ہوتا جو موجودہ نظام زرداری کے ٹھیکیداروں اور قاتلوں، ظالموں کو ختم کر دیتا۔ لیکن میں ایک معذور انسان ہوں جسے جینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اچانک اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ اس کو محسوس ہوا کہ کچھ لوگ اس کے قریب موجود ہیں جو اس سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے نوجوانوں

باقی صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں

جدوجہد آزادی کے کشمیری مجرم

صدر بھٹو کے نام —— امان اللہ خان کا ایک کھلا خط

آزاد کشمیر کو خود مختار ریاست تسلیم کیا جائے

جناب ذوالفقار علی بھٹو

میں اس خط میں آپ کو بھٹو صاحب کے نام سے اس لئے مخاطب ہو رہا ہوں کہ پاکستان کے صدر ہونے کے علاوہ بھی آپ کی ذات ہمارے لئے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے جس کا شاید خود آپ کو بھی علم ہے۔ اس لئے میں صدر پاکستان سے نہیں بلکہ مظلوم اقوام کے حقِ آزادی کے علمبردار ذوالفقار علی بھٹو سے مخاطب ہوں۔

بھٹو صاحب! ہمیں صدر پاکستان کی حیثیت سے آپ کی مشکلات کا بخوبی احساس ہے۔ ہمیں ان اندرونی اور بیرونی مسائل کا بھی احساس ہے جن سے آپ بحیثیت صدر پاکستان دوچار ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ جن حالات میں آپ نے ملک کی عنانِ حکومت سنبھالی تھی وہ پاکستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا اور پاکستان بظاہر چند دنوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں شاید ہی پاکستان کا کوئی اور لیڈر قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو سہارا دے سکتا۔ میں اس وقت گلگت کی ایک فوجی چھاؤنی میں قید تھا سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبر سن کر دوسروں کی طرح مجھے بھی سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پھر آپ کی پہلی صدارتی تقریر سننے کا موقع ملا تو امید بندھی کہ بھٹو باقیماندہ پاکستان کو بچا لے گا اور اس کی بین الاقوامی ساکھ کو بحال کریگا۔

بھٹو صاحب! آپ کو آزاد کشمیر میں کچھ ایسے لیڈر ضرور ملیں گے جو ہر صورتِ حال میں آپ کی اس وقت تک ہاں میں ہاں ملائیں گے جب تک آپ برسرِ اقتدار ہیں بشرطیکہ آپ ان کو اقتدار کا لالچ دیں یا ان کے اقتدار کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ جس شخص نے اقتدار حاصل کرنے اور بعد میں اقتدار کے تحفظ کی خاطر ایوب خاں کو صلاح الدین ایوبی قرار دیا اور یحییٰ خان کی تعریفیں کرتا رہا جس شخص نے آزادیٔ کشمیر کے نام پر المجاہد تحریک کا ڈھونگ رچا کر پاکستان اور کشمیری عوام سے اتنا بڑا فراڈ کیا کیا وہ آپ کو بُن بوتراب زمانہ کا خطاب دے کر مقبوضہ کشمیر آزادی کی قیمت پر اپنی نوکری پکی نہیں کر سکتا؟ لیکن نہیں بوتراب زمانہ کا لقب تو انہوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ (اگر یقین نہ آئے تو دیکھئے ہفت روزہ "زندگی" ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء) بہرحال وہ آپ کو اسی جیسا کوئی اور لقب دے سکتا ہے۔ باقی رہے ہم۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم ہر چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرنے کے عادی نہیں۔ میری پندرہ ماہ کی اسیری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں نے نومبر ۱۹۷۰ء میں گلگت میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ یہ ملک یحییٰ خان کے باپ کی جاگیر نہیں۔ یہ ملک عوام کا ہے۔ اس وقت ہر طرف یحییٰ خان کا طوطی بول رہا تھا لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ شخص اس ملک کا بیڑا غرق کر دے گا۔ ہم نے تو پندرہ ماہ کی قید کاٹی لیکن یحییٰ خان کے بارے میں ہمارا نظریہ سو فیصد صحیح نکلا۔

بھٹو صاحب! ہم نے اس وقت آپ کا ساتھ دیا جب آپ زیرِ عتاب تھے اور ایوب خاں اور یحییٰ خاں کی قسمت کا سورج انتہائی عروج پر تھا۔ ہم نے شاہی قلعے میں پولیس کے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر کے شدید ترین جسمانی اذیتیں برداشت کیں کہ ہم یہ بیان دیں کہ بھارتی جہاز گنگا بھٹو نے اغوا کروایا تھا۔ تاکہ اقتدار شیخ مجیب الرحمان کو منتقل نہ ہو سکے۔ ہم آپ سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنے کی وجہ سے دائیں بازو کی پارٹیوں اور ان کے پریس کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے۔ اس کے باوجود آپ کے دورِ صدارت میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں اس کا گلہ نہیں۔ دورِ ابتلا کا تاریک ترین حصہ تو ہم یحییٰ خاں کے زمانے میں گذار چکے ہیں۔ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ جدوجہد آزادی اور دار و رسن لازم و ملزوم ہیں البتہ جب سلسلۂ دار و رسن دوستوں اور حامیوں کی طرف سے شروع ہو تو ذہنی اذیت میں اضافہ قدرتی امر ہے۔ اس کے باوجود ہم آپ سے اس بارے میں گلہ نہیں کر رہے بلکہ اسے تاریخ کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ آپ سے مخاطب ہونے کا موضوع کچھ اور ہے۔

بھٹو صاحب! ہم ان لوگوں میں سے بھی نہیں جو آپ کی مشکلات کو نظر انداز کر کے آپ سے طرح طرح کے مطالبات کرتے ہیں۔ ہم آپ کی طرف سے کئے گئے گلگت بلتستان سے متعلق اقدامات اور آزاد کشمیر کو نظر انداز کئے جانے سے متعلق حق گوئی کے لئے آپ کے مشکور ہیں۔ لیکن میں جس مسئلے کے متعلق آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں وہ ستر لاکھ کشمیریوں کی زندگی اور موت (آزادی اور غلامی کو زندگی اور موت سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے) کا مسئلہ ہے اس لئے امید ہے کہ آپ میری گذارشات اور تلخ گوئی پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

بھٹو صاحب! جن حالات میں آپ شملہ گئے تھے ان کی نزاکت کا ہمیں بخوبی احساس تھا۔ ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ اس تاریخی سیاسی مقابلے کے دوران سارے کے سارے ٹرمپ کارڈ بھارت کے ہاتھ میں تھے۔ ہم دست بدعا تھے کہ خدا آپ کو وہاں سے کامیاب و کامران واپس لائے۔ ہم نے دعا پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسے عملی اقدامات بھی کئے جن سے آپ کی پوزیشن مضبوط ہو سکتی تھی۔ میں نے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور مولوی فاروق سمیت تمام محبِ وطن کشمیری لیڈروں کو خطوط لکھے جن میں ان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ ایسا لائحہ عمل اختیار کریں جس سے اس نازک مرحلے پر مسئلہ کشمیر کم از کم زندہ رہے۔ میرا خط شیخ صاحب کو ملا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہی دنوں مختلف ذرائع نے یہ خبر پھیلا دی تھی کہ شیخ محمد عبداللہ بھارت کے اندر ہی ریاست کی داخلی خود مختاری لے کر بھارت سے مصالحت کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان کی اس مبینہ ذہنی تبدیلی کی شدت سے مخالفت کی تھی اور اس خط میں بھی اس کا تفصیلی اظہار کیا تھا۔

بھارت مقبوضہ کشمیر کو طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کریگا

معاہدۂ شملہ کے ایک ہفتے کے بعد میں نے ایک انگریزی ہفت روزہ میں ایک مضمون کے ذریعہ اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان معاہدۂ شملہ کے تحت مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے پرانے موقف سے ہٹ گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل یہ تھے۔

۱۔ معاہدہ شملہ میں کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۔ معاہدہ شملہ میں کہا گیا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے حکام باہمی گفت و شنید کریں گے جس کے بعد اس مسئلے پر آخری فیصلہ بھارت اور پاکستان کے سربراہانِ حکومت کریں گے۔ اس میں کشمیریوں کی رائے یا ان سے مشورے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ مسئلہ دونوں ملکوں کی افسر شاہی کے فیصلوں کے مطابق ہوگا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ افسر شاہی عوامی رائے اور جذبات کا کتنا احترام کرتی ہے۔

۳۔ چونکہ آئندہ باہمی گفت و شنید کو ہی مسئلے کے حل کا واحد طریقہ قرار دیا گیا ہے، اس لئے مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی نوعیت ختم ہو جائے گی۔ اور پاکستان اس پوزیشن میں نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں ہو سکتا ہے کہ وہ کشمیر کے بارے میں بھارت سے اپنا موقف منوالے۔

۴۔ بھارت کرگل اور لیپا میں دفاعی طور پر نہایت اہم مقامات پر قابض رہے گا اور یہ صورتِ حال اسے پاکستان پر دفاعی برتری عطا کرتی ہے۔

۵۔ کشمیر میں حدِ متارکہ جنگ کو کنٹرول لائن کہا جائیگا۔ اس کے نتائج یہ ہوں گے کہ بالآخر بھارت اقوام متحدہ کے مبصروں کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور اس طرح مسئلہ کشمیر کا بین الاقوامی کردار بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔ اسکے علاوہ بھارت کنٹرول لائن کو ہی پاک بھارت سرحد قرار دینے کی کوشش کرے گا۔

ہمارے کچھ خدشات تو پہلے ہی درست ثابت ہوئے ہیں اور کچھ آئندہ ہوں گے اس کے باوجود اس سلسلے میں ہم نے زیادہ شور نہیں مچایا۔ اس لئے کہ ہمیں کانفرنس ٹیبل پر آپ کی کمزور پوزیشن کا پورا پورا احساس تھا۔

بھٹو صاحب! آپ نے قومی اسمبلی میں اپنی تاریخی تقریر کے دوران مسئلہ کشمیر کا تجزیہ کیا تھا اور اس سے متعلق چند اصولوں کی نشاندہی کی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ انقلاب درآمد نہیں کئے جاتے بلکہ انقلاب کو محکوم قوم کے اندر ہی جنم لینا چاہیئے۔ آپ نے ہمارے اس نظریے کی بھی تائید کی تھی کہ اقوام متحدہ پر تکیہ کر کے بیٹھ جانا خود کشی کے مترادف ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ مسئلہ کشمیر اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک خود کشمیری خاموش نہیں ہو جاتے۔ آپ نے اسمبلی میں دنیا بھر کے ممالک کے سفیروں کی موجودگی میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اگر کشمیری ریاست کی خود مختاری کے لئے کوئی منظم تحریک چلائیں تو پاکستان نتائج کی پرواہ کئے بغیر ان کی بھرپور مدد کریگا۔ چنانچہ ہم نے جموں و کشمیر محاذ رائے شماری کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۲۷ / اگست ۱۹۷۲ء میں اس حقیقت پسندی پر آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

چونکہ آپ نے ذمہ داری کشمیریوں پر ڈالی تھی (اور یہ ذمہ داری واقعی بنیادی طور پر ان ہی کی ہے کہ وہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں) اور ہماری ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ ہم آپ کی فراخدلانہ پیش کش کو قبول کر کے اس کا عملی جواب دیتے۔ چنانچہ ہم نے اپنی پہلی فرصت میں آپ کو ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں چند ضروری امور کی وضاحت مانگی گئی تھی اور ملاقات کے لئے وقت مانگا گیا تھا۔ لیکن کئی ماہ گزرنے کے باوجود آج تک ہمارے خط کا جواب تک نہیں

آپ کی دلیل سے بھارت، امریکہ اور اسرائیل فائدہ اٹھائیں گے

ملا۔ آپ کی پیش کش کا اگر آزاد کشمیر کے "اصلی اور بڑے" لیڈروں کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو اس میں ہمارا کیا قصور۔

تاؤ بٹ چک کا مسئلہ کھڑا ہوا تو شروع میں آپ نے کہا کہ یہ مسئلہ اصول کا ہے اور ہم اصول کا سودا نہیں کرتے۔ واقعی یہ اصول کا مسئلہ تھا کیونکہ یہ ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کی سرحد کی آئینی نوعیت کا سوال تھا۔ معاہدہ شملہ اس بارے میں خاموش تھا۔ اور اصول کا سوال یہ تھا کہ اگر آپ اسے پاک بھارت سرحد قرار دیں اور تاؤ بٹ چک (جو ریاست کے بھارتی مقبوضہ کا حصہ ہے جس پر جنگ کے دوران پاکستان نے قبضہ کیا تھا اور جو پاک کشمیر سرحد پر واقع ہے) بھارت کے حوالے کریں تو اس کا مطلب یہ نکلتا کہ آپ ریاست کے مقبوضہ حصے کو بھارت کا حصہ تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ معاہدہ شملہ کے مطابق صرف پاک بھارت سرحد سے ہی مقبوضہ علاقے خالی کرنے تھے۔ اس لئے یہ مسئلہ واقعی اصول کا تھا اور ہم اپنی ذاتی محفلوں میں آپ کے استدلال کی پوری طرح وکالت کرتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد آپ نے کہنا شروع کیا کہ ہم تاؤ بٹ چک سے فوجیں ہٹانے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ بھارت کوئی متبادل ٹکڑا ہمیں دے دے اور آخر کار تاؤ بٹ چک کو بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ ہمیں آپ کی پوزیشن کا احساس ہے لیکن یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس ٹکڑے کو بھارت کے حوالے کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا تو اصول کی باتیں کرنے اور ان کی وسیع تشہیر کا کیا جواز تھا۔

بھٹو صاحب! بین الاقوامی معاملات کے ماہر کی حیثیت سے آپ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ بین الاقوامی زبان میں حقِ خود ارادیت کسے کہتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ محکوم قوموں کے حقِ خود ارادیت کو مشروط یا محدود بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ یہ بھی مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر حل کیا جانا چاہیئے، اس لئے جب آپ کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارتیوں جیسے دلائل سامنے آتے ہیں تو ہمیں شدید دکھ ہوتا ہے۔ میرا اشارہ آپ کے نمائندہ جنگ کو دیئے جانے والے حالیہ انٹرویو کی طرف ہے۔ جس میں آپ نے کہا ہے کہ ہم آزاد کشمیر کو تسلیم کرنے کے لئے اس لئے تیار نہیں کہ ایسا کرنا پاکستان کے مفادات کے منافی ہے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ اس قسم کی دلیل ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ بہر حال چونکہ یہ خبر پاکستان کے تمام اخباروں میں شائع ہو چکی ہے اس لئے اس کی صحت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

بھٹو صاحب! کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اگر آزاد کشمیر کو تسلیم کرنے کے مطالبے کو آپ اس لئے مسترد کرتے ہیں کہ یہ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے تو کیا آپ اس دلیل سے بھارت کے اس استدلال کی کہ مقبوضہ کشمیر سے دست بردار ہونا بھارت کے مفاد میں نہیں ہے بالواسطہ طور پر حمایت نہیں کر رہے۔ اگر آپ کشمیریوں کے کسی مطالبے کو پاکستان کے مفاد کے نام پر رد کرتے ہیں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بھارت اپنے مفادات کو نظر انداز کر کے مقبوضہ کشمیر آپ کو سونے کی طشتری میں پیش کرے گا۔

ان دلائل سے تو آپ نے عرب مقبوضہ علاقوں کے بارے میں اسرائیلی استدلال اور ویت نام کے بارے میں امریکی موقف کی بھی حمایت کی ہے۔ کیوں کہ دونوں یہ کہتے ہیں کہ مقبوضہ عرب علاقے اور ویت نام کو خالی کرنا اسرائیل اور امریکہ کے قومی مفادات کے منافی ہے۔

بھٹو صاحب! ہم یہ بات ہرگز نہیں کہتے کہ آپ کشمیریوں کے لئے پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچائیں۔ ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہمارا یہ مطالبہ بھی تو اتنا ہی وزنی ہے کہ پاکستان کے مفادات کے نام پر کشمیریوں کی آزادی کو بھی قربان نہ کیا جائے۔

ہم یہ بات سوچنے سے قاصر ہیں کہ ۸۰ فیصد آبادی پر مشتمل ایک ہمسایہ ریاست (جس کا دو تہائی حصہ اس وقت بھارت کے قبضے میں ہے) اگر آزاد ہو جائے اور اس میں بھارتی مقبوضہ علاقے بھی شامل ہوں تو یہ امر پاکستان کے مفادات کے لئے کس طرح نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک آزاد و خود مختار ریاست جموں و کشمیر (جس میں مقبوضہ کشمیر بھی شامل ہو) پاکستان کے لئے دفاعی۔ سیاسی۔ معاشی اور جغرافیائی لحاظ سے ریاست کی موجودہ پوزیشن کی نسبت کہیں زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

بھٹو صاحب! ہمارے پاس آپ کے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری کے ان خطوط کی نقلیں موجود ہیں جن میں آپ نے صاف صاف الفاظ میں کہا ہے کہ کشمیریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ساری ریاست کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنا سکتے ہیں۔ اس بارے میں آپ نے ہمیں زبانی بھی کہا تھا کہ آپ حقِ خود ارادیت میں حقِ خود مختاری کو شامل سمجھتے ہیں۔ آج جب ہم آپ کے خطوط۔ آپ کی زبانی یقین دہانی۔ آپ کی قومی اسمبلی کی تقریر اور آپ کے تازہ ترین بیان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ آپ کے کس استدلال کو آپ کے دلی جذبات اور نظریات تصور کریں۔

بھٹو صاحب! ہمیں مقبوضہ کشمیر کے کچھ حریت پسندوں کی طرف سے خطوط ملے ہیں جن میں ہم سے کہا گیا ہے کہ بھٹو صاحب سے کہیں کہ وہ آزاد کشمیر کو خود مختار مملکت تسلیم کریں تا کہ ہمیں بھی بھارت سے اسی قسم کا مطالبہ کرنے میں آسانی ہو اور ہمارے مطالبے کو بین الاقوامی حمایت بھی حاصل ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب اس مسئلے کو حل کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں آپ سے ملاقات کرنے کی کوشش کی لیکن ہم جیسے چھوٹے لوگوں کی آپ کی بارگاہ تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ اب آپ کی طرف سے آزاد کشمیر کو ریاست کی خود مختار حکومت تسلیم کرنے کے مطالبے کو رد کرنے کے بعد مقبوضہ کشمیر کے حریت پسندوں کے دلوں پر کیا گزری ہو گی۔ اس کا اندازہ آپ خود کریں۔

بھٹو صاحب! ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت سے آپ کو تاریخ کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ آپکو پاکستان کی ہی نہیں کشمیر کی آئندہ نسلوں کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے۔

آپ کا مخلص ـــــ امان اللہ خان،
پبلسٹی سیکرٹری جموں و کشمیر محاذ رائے شماری و ممبر سنٹرل کمیٹی جموں و کشمیر قومی محاذِ آزادی۔ (این۔ ایل۔ ایف)

بقیہ
بجھتا چراغ

سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج مجھے خوشی ہے کہ میرے محنت کشوں نے مرنا سیکھ لیا ہے۔ سسک سسک کر مرنا نہیں بلکہ اپنے حقوق کے حصول کی خاطر جدوجہد کرتے ہوئے مرنا۔ اور جب کوئی طبقہ مرنا سیکھ لیتا ہے تو اسے جینے کے ڈھنگ بھی آجاتے ہیں۔ آج میرے شہید ہونے والے ساتھیوں نے ظالم حکمرانوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب وہ مزید غلامی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے دلوں سے تمام خوف نکل چکے ہیں، جو غلامی کو جنم دیتے ہیں۔ میرے ساتھیوں تم نے نجات کا راستہ تلاش کر لیا ہے اور ہمیشہ صداقت کو اپنا نصب العین بناتے ہوئے اس فرسودہ نظام کے خلاف جدوجہد جاری رکھو۔ ایک دن فتح تمھاری ہو گی تم زندہ رہو گے کیوں کہ تم نے مرنا سیکھ لیا ہے۔ اور وہ صبح ضرور ہو گی جو وطن کے لوگوں کو آزادی کا مژدہ سنائے گی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

صبح جب بستی کے لوگ بوڑھے کی جھونپڑی میں پہنچے تو وہ ابدی نیند سو چکا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے"

پردہ چاک

ریلوے کو مالی نقصان پہنچانے کی سازش تباہ کن ثابت ہوگی

کے-ٹو سگریٹ کے بنڈل راستے میں غائب کر دیئے گئے

الفتح رپورٹ

جمہوریت کی بحالی سے قبل سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں بدعنوانیاں پردے میں ہوتی تھیں۔ مگر جمہوریت کی بحالی کے بعد اب پردے کا تکلف ختم کر دیا گیا۔ اب جو کچھ ہوتا ہے عین آنکھوں کے سامنے ہر قسم کا ڈر، خوف اور احتساب کا کھٹکا ختم ہو گیا۔ شاید جمہوریت کی بحالی کا یہی مطلب لیا گیا ہے کہ کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں رہا ہے، لہٰذا جس کا جو جی چاہے کرے۔ ریلوے ایک نفع بخش ادارہ ہے، مگر بدعنوان نوکر شاہی کی وجہ سے یہ ادارہ ہر سال کروڑوں روپے کے خسارے میں جا رہا ہے۔ سالانہ لاکھوں روپے کی سرکاری رقم کسی نہ کسی صورت سے خورد برد کر دی جاتی ہے۔ ریلوے کے اعلیٰ افسران کے ہاتھ بھی کالے ہیں اس لئے اس ادارے سے بدعنوانی ختم کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

لاڑکانہ دادو سیکشن کے ریلوے کمرشل اسٹاف کو لاڑکانہ کے ٹو سگریٹ ایجنسی سے ملا دیا گیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اسٹاف کے بعض بدعنوان کلرک ہر ماہ ہزاروں روپے پیٹ رہے ہیں اور ہر سال لاکھوں روپے کے نقصان کو ریلوے کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

ریلوے کمرشل اسٹاف کے کلرک باقاعدہ سیل لگے ہوئے ویگنوں کو توڑ کر کے ٹو سگریٹ کے ہزاروں پیکٹ غائب کر دیتے ہیں۔ منزل پر پہنچنے کے بعد جب مال کی چیکنگ ہوتی ہے تو خورد برد کا انکشاف ہوتا ہے اسطرح۔ ہر ماہ ریلوے کو ایجنسی کے دعویٰ کے مطابق ہزاروں روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس قسم کی ادائیگی سالانہ لاکھوں روپے پر جا کر بیٹھتی ہے۔ ڈویژنل کمرشل سیکشن، کمرشل حکام اور کلیم سیکشن لاہور برابر کے شریک بتائے جاتے ہیں۔

لاڑکانہ دادو سیکشن میں یہ کاروبار معمول بن چکا ہے۔ ریلوے واچ اینڈ وارڈ کے سب انسپکٹر مسٹر عبدالحمید خان نے اس واقعہ کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہوئے ریلوے حکام سے مطالبہ کیا کہ اس قسم کی بدعنوانی کی مؤثر روک تھام کی جائے۔ بصورت دیگر ریلوے کو مالی اعتبار سے نقصان پہنچانے کی سازش تباہ کن ثابت ہوگی۔ ان کی تحریری اطلاع کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرشل حکام خود اس گندے کھیل میں ملوث ہیں۔ یہی نہیں کہ اس انکشاف کے بعد کوئی ایکشن نہیں لیا گیا بلکہ اس کاروبار کو پہلے سے زیادہ سرگرمی سے جاری رکھا گیا۔

جیکب آباد کے ریلوے گارڈ شفیق احمد خان کے علم میں جب یہ بات آئی تو اس نے اے سی او-۱ سکھر سے کچھ ضروری

FORM "A"

(NOTICE)

No:- SGC/209/69

Dated: 10-11-1971.

From:- The ACO-I,
P.W.R. Sukkur.

To:- Mr: Shafiq Ahmad Khan
Guard C/o SM/JCD.

You are hereby directed to explain the below mentioned charges within Seven days of the receipt of this Notice and give reasons as to why action under Railway Employees (Discipline & Efficiency) Rules of 1961 may not be taken against you and you may be punished accordingly.

CHARGES

1) For addressing application dated 25-9-71 direct to the higher authorities and thereby exceeding limit and breach of directive contained in this Office Circular letter No. 324-E/1/P4 dated 21-1-65.

2) For using indecent, indiscrete and impolite language in your application referred to in para I above.

Sd/-
ACO-I/P.W.R./Sukkur.

جواب طلبی کے حکم نامے کا عکس

بدعنوانی سے آگاہ کرنے والا افسران کے غیض وغضب کا شکار ہو گیا

کاغذات طلب کئے اور درخواست کی کہ پی ڈبلیو ریلوے ڈسپلن اینڈ اپیلز/افیشینسی رولز ۱۹۶۱ء کے تحت تحقیقات کرائی جائے۔ لیکن ملزموں کو بچانے کے لئے اس تجویز کو رد کر دیا گیا۔ اور تحقیقات کے اخراجات مذکورہ گارڈ کی تنخواہ سے جبراً وضع کر لئے گئے۔

جیکب آباد کے ریلوے گارڈ شفیق احمد خان نے ریلوے کمرشل حکام سے بار بار اپیلیں کیں کہ ریلوے پولیس کے ذریعہ باقاعدہ تحقیقات کرائی جائے۔ لیکن اس کی اپیلوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈویژنل آفس کے اے سی او سکھر۔ اے نے اُسے طلب کیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ ڈی سی او سکھر کو اس کیس کی تمام تفصیلات سے آگاہ کرے۔ اس نے ہدایت کے مطابق کے ٹو سگریٹوں کی چوری کی تمام تفصیلات تحریری طور پر ڈی سی او سکھر کے حوالے کر دیں۔ لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ملزموں کو تحفظ دیا گیا۔ اور گارڈ کو خاموش کرنے کے لئے اس کی تنخواہ کی کٹوتی کی شرح میں کچھ کمی کر دی گئی۔

ریلوے گارڈ نے جب دیکھا کہ یہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے تو اس نے مجبوراً اُس وقت کے صدر یحییٰ خان، گورنر عتیق الرحمٰن گورنر رحمان گل اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو تحریری شکل میں اس بدعنوانی سے آگاہ کیا۔ اس نے ملک و قوم کی

ایجنسیاں ہر ماہ، ہرجانے کی شکل میں لاکھوں روپے وصول کر رہی ہیں

ہمدردی میں یہ قدم اُٹھایا تھا، مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ اُوپر سے نیچے تک ہر شخص گمراہی میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہے۔ یحییٰ خان کو شراب و کباب اور رنگ رلیوں سے کہاں فرصت تھی کہ وہ ایک مخلص اور ایماندار شہری کی آواز سنتا۔ اس کی تحریری درخواست پر غور کرنے اور بدعنوانی ختم کرنے کی بجائے الٹا گارڈ کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی شروع کر دی گئی کہ اس نے براہِ راست صدر پاکستان اور گورنروں کو کیوں خط لکھا۔؟ اُس سے سات روز کے اندر اندر جواب طلب کیا گیا کہ کیوں نہ اس کے خلاف ریلوے ایمپلائز رولز ۱۹۶۱ء کے تحت کارروائی کی جائے اور قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس پر الزام لگایا کہ اُس نے

(الف) ۲۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کو براہِ راست اعلیٰ حکام کو خط لکھ کر اپنے حدود سے تجاوز کیا اور سرکاری ہدایت کی خلاف ورزی کی۔

(ب) اپنے خط میں ناشائستہ، گستاخانہ اور سخت زبان استعمال کی۔

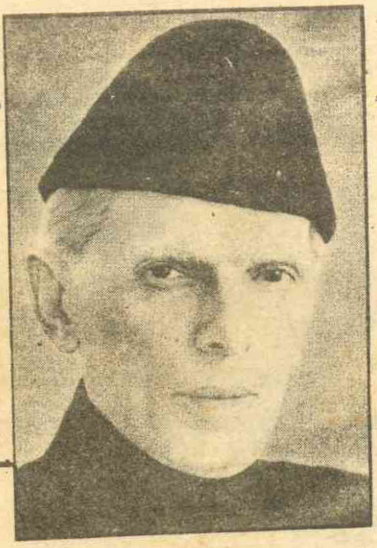
آپ نے غور کیا کہ جس مخلص شخص کے پیٹ میں ملک و قوم کی ہمدردی کا درد اُٹھتا ہے، اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

ریلوے ایک انتہائی منافع بخش ادارہ ہے، اگر اس ادارے سے بدعنوانی ختم کر دی جائے تو حکومت کو سالانہ کروڑوں روپے کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل ریلوے ڈویژن کی آمدنی سالانہ سترہ کروڑ روپے تھی۔ لیکن تقسیم کے بعد دہلی اور فیروزپور ڈویژن بھارت کے ساتھ چلا گیا، چنانچہ ریلوے کی آمدنی میں کمی ایک لازمی امر تھی۔ اس کے باوجود ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں ہماری ریلوے کی آمدنی سالانہ ۲۴ کروڑ روپے تھی ۱۹۵۲ء کے بعد ملک میں سیاسی افراتفری اور انتشار کا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں سیاسی استحکام ختم ہو گیا۔ ریلوے کی نوکر شاہی مطلق العنان ہو گئی۔ اعلیٰ افسروں اور بدعنوان عملے نے ریلوے میں رشوت، اقربا پروری، خورد برد اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیا۔ ریلوے کی سالانہ آمدنی کو اس حد تک متاثر کیا گیا کہ گذشتہ کئی سالوں سے یہ ادارہ خسارہ میں چل رہا ہے۔ حکومت کو ہر مرتبہ اپنے خزانے سے اس بے حد منافع بخش ادارے کے خسارے کو پورا کرنا پڑتا ہے

ریلوے گارڈ کے بیان کے مطابق ۲ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس کی ڈیوٹی ۲۹۳ اَپ میں تھی۔ اس کے ساتھ سی آر وین پی ڈبلیو سی ۳۲۲۱۳/ ایل آر کے/ بی آر سی ڈی۔ جے سی ڈی کو منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس ویگن میں کے ٹو سگریٹ کے اہم بنڈل رکھے گئے تھے جنہیں شہداد کوٹ میں اتارا جانا تھا۔ ان بنڈلوں کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ اور بظاہر شک و شبہ کی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ گاڑی جب شہداد کوٹ پہنچی تو حیرت انگیز واقعہ ظہور میں آیا۔ سگریٹوں کے کئی بنڈل کھلے ہوئے تھے اور ان میں سے سینکڑوں پیکٹ غائب تھے۔

اس واقعہ کی تحقیقات کرنے والے لاہور ہیڈ کوارٹر کے گڈز کلرک نے بدعنوانی میں ملوث دوسرے گڈز کلرک کے جرائم پر مکمل پردہ پوشی کی اور اپنی رپورٹ میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہانک کر ساری ذمہ داری ریلوے گارڈ شفیق احمد خان پر ڈال دی۔ اگر سگریٹوں کی چوری کے واقعات کی باقاعدہ تحقیقات کرائی جائے تو آسانی سے مجرموں کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔

ریلوے میں سگریٹ کے بنڈلوں کی چوری کے علاوہ دیگر بھیجی جانے والی اشیاء کی چوری بھی عام ہوتی جا رہی ہے ادویات ڈی ٹول، پالش، صابن، اے بی بسکٹ اور بہت سی دوسری چیزیں درمیانی راستے سے غائب کر دی جاتی ہیں اور ایجنسیاں اپنے مال کی چوری کا ہرجانہ ریلوے سے وصول کرتی ہیں۔ اس طرح کمرشل اسٹاف کا بدعنوان عملہ ریلوے کو سالانہ لاکھوں روپے کا نقصان پہنچا رہا ہے۔



بوڑھے معمار کا خواب ادھورا نہیں رہیگا

الفتح فیچر

بوڑھا معمار جب اس عمارت کی تعمیر کر رہا تھا تو اس کے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ جب وہ دور افق کے پار چلا گیا تو لٹیروں نے اس نامکمل عمارت پر قبضہ کرلیا۔ انھوں نے نئی نئی دیواریں کھڑی کر دیں۔ اور یہ عمارت نفاق اور عصبیت کی آگ میں جلنے لگی۔ نفرت کے شعلے اس عمارت کے مکینوں کی روحوں کو چاٹتے رہے۔

لیڈر نئے نئے بھیس میں آتے رہے۔ یہ عمارت اب تک جل رہی ہے۔ اس کے ستون کھوکھلے ہو رہے ہیں۔ اینٹیں دھڑا دھڑ نیچے گر رہی ہیں۔ خوشیوں کا نیلام اب تک ہو رہا ہے۔ لوگ اب تک زندگی کے بوجھ تلے سسک رہے ہیں۔

بوڑھے معمار نے سوچا تھا کہ اس عمارت کے مکینوں میں سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ کوئی کسی کو نہیں لوٹے گا۔ کوئی کسی کی خوشیاں نہیں چھینے گا۔ سب مل جل کر اس عمارت کی تعمیر کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

اس نے کہا تھا۔ "میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کر دوں کہ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے وہ انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز ہے۔ اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خود غرض بنا دیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی مقصد برآوری کے لئے عوام کا استحصال کرنے کی خوئے بد ان کے خون میں رچ گئی ہے..... حرص و ہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ وہ جلبِ منفعت کی خاطر دشمن کے آلۂ کار بن جاتے ہیں...... میں نے دیہات میں جا کر خود دیکھا ہے۔ ہمارے عوام میں لاکھوں ایسے ہیں جنھیں دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کیا آپ اسے تہذیب اور ترقی کا نام دیں گے؟

کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟

کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے، اور اب ان کے لئے دن میں ایک بار کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔

اگر وہ سرمایہ دار اور زمیندار عقلمند ہیں تو وہ نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خدا ان کے حال پر رحم کرے۔

ہم ان کی کوئی مدد نہیں کریں گے!"

پھر اس نے کہا،

"ہمیں مغرب کے معاشی نظام سے کوئی سکون اور خوشحالی نصیب نہ ہوگی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے، جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے تصورات پر قائم ہو۔"

بوڑھے معمار کی آواز چاروں طرف پھیلی بھی نہ تھی کہ موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

وہ مر گیا تو لوگ اس کے اصولوں کو من مانے انداز میں پیش کرنے لگے۔ اس نے جن سرمایہ داروں اور زمینداروں کو ظالم اور شر پسند کہا تھا، آج وہی انتہائی ظالمانہ انداز میں اس عمارت کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ دوست اور غمگسار بن کر آتے ہیں اور پیچھے سے ان کی پیٹھ میں چھری بھونک دیتے ہیں۔

آج بھی ہزاروں انسان ایک وقت کی روٹی کے لئے ترس رہے ہیں۔ کسان کھیتوں سے سونا اگاتا ہے، لیکن اس کی جھونپڑی میں چولھا نہیں جلتا۔ مزدور اپنے لہو سے دولت پیدا کرتا ہے، لیکن اس کے بچے بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں۔ "بڑے" لوگ ائیر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہتے ہیں، لمبی لمبی کاروں میں سفر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے کھانے چکھتے ہیں۔ اور "چھوٹے" لوگ اپنی جھونپڑیوں میں اپنی سسکتی ہوئی زندگی کا نوحہ سنتے رہتے ہیں۔

بوڑھے معمار نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی عمارت میں رہنے والے کچھ لوگ "چھوٹے" ہوں گے اور کچھ لوگ "بڑے" ہوں گے۔ اس کا خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ اس کی آرزوئیں اب تک پرانے ظالمانہ نظام کی آگ میں جل رہی ہیں۔

چند لوگ خوشیوں کے خزانے پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں، اور اکثریت دکھوں کی بھٹی میں سسک رہی ہے۔ ہر حکمراں جماعت لوگوں کو یہ خواب دکھاتی رہی کہ وہ مساوات کا نظام قائم کرے گی۔ لیکن ان کے سارے وعدے سراب ثابت ہوئے۔ وہ سب لٹیرے تھے۔ اور لٹیرے اب تک اس عمارت کو لوٹ رہے ہیں۔ جب دکھوں کی آگ میں جلنے والے "چھوٹے" لوگ اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں تو انھیں قوت کے زور پر کچل دیا جاتا ہے۔ انھیں فتنہ پرور کہا جاتا ہے۔ یہ مذموم روایات اب تک زندہ ہیں۔ حق کے لئے آواز اٹھانے والا اس عمارت کا دشمن ہے۔ خوشیوں کی آرزو کرنے والا غدار ہے۔

لیکن اب اس عمارت کے غریب اور "چھوٹے" لوگ جاگ رہے ہیں۔ وہ "بڑوں" کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اب وہ چند گنے چنے لوگوں کو اپنی خوشیاں چھیننے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اب دشمن خواہ کسی روپ میں آئے، وہ اسے اپنے اوپر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ وہ کسی کو لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیں گے۔ ان کا شعور پہلے سے بہت بلند ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ہر دشمن کو پہچانتے ہیں، اور ان کے خلاف جدوجہد کرنے کا طریقہ سیکھ رہے ہیں۔ وہ آپس میں متحد ہو رہے ہیں اور ظالموں کے خلاف جگہ جگہ محاذ بنا رہے ہیں۔

اس ظالمانہ نظام کی موت یقینی ہے۔

بوڑھے معمار کا خواب ادھورا نہیں رہے گا۔

غریب لوگ، جو صدیوں سے دکھوں کی بھٹی میں سلگ رہے ہیں، اپنے حقوق لے کر رہیں گے۔ وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لئے اس عمارت کے صحن میں ایک بہت بڑی قبر کھود رہے ہیں۔ یہ قبر بوڑھے معمار کی آرزوؤں کی تکمیل کرے گی۔

حلقۂ قارئین الفتح

پیپلز پارٹی کے قومی کنونشن کے بارے میں ایک مندوب کے تاثرات

کنونشن میں شخصیت پرستوں کو مدعو کیا گیا تھا

پیپلز پارٹی کے قومی کنونشن سے پارٹی کارکنوں کی امیدیں اتنی ہی وابستہ تھیں جتنی پارٹی کو اقتدار ملنے سے قبل، پارٹی کے چیئرمین اور ہائی کمان سے۔ جس طرح پارٹی کے مخلص کارکنوں نے الیکشن جیتنے سے پہلے سوشلزم کے خواب دیکھے تھے اور اقتدار ملنے کے بعد اُس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے، اسی طرح قومی کنونشن سے پہلے کارکنوں نے کنونشن میں اپنے دل کا غبار نکالنے، اپنا دکھ درد بیان کرنے اور اپنے قائد سے گلہ شکوہ کرنے کی جو اُمیدیں لگائی ہوئی تھیں وُہ بھی پوری نہ کر سکے۔ بہرحال آج اگر پارٹی کی ہائی کمان کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے تو یہ بھی غلطی ہو گی۔ بنیادی غلطی تو غربت کی چکی میں پسے ہوئے کارکنوں سے ہوئی جنہوں نے سوشلسٹ نظام لانے کی سرمایہ دار طبقے سے اُمیدیں وابستہ کیں۔ اور یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ محنت کش طبقہ کو ذہنی تربیت ہی نہیں دی گئی۔ طبقاتی جدوجہد اور طبقاتی فرق کا احساس ہی نہ دلایا گیا۔ اور آج بھی کنونشن میں شمولیت کے بعد صحیح لائینوں پر سوچنے سے گریز کر رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ قومی کنونشن کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات بیان کرنے کا مقصد بغاوت قطعاً نہیں۔ وفاداری اصولوں، نظریات اور منشور سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ میرا بنیادی حق ہے کہ میں "جان کی امان پاؤں" کہے بغیر یہ حق ادا کروں۔

کنونشن میں ماسوائے چند ایک کے نہایت مضبوط قسم کے شخصیت پرستوں کو مدعو کیا گیا۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی کچھ کارکنوں کو بھی کارڈ دیئے گئے۔ اکثریت کو مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ کسی ایک کو بولنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ اور بعض کو غلط فہمی میں بولنے کی اجازت بھی دی گئی۔

جناب شیخ رشید صاحب، صدر پنجاب کو سب سے پہلے بلایا گیا۔ شیخ صاحب نے صحیح کارکنوں کو کارڈ نہ ملنے کا شکوہ بھی کیا اور مقررین کی فہرست اپنی مرضی سے مرتب کرنے پر گلہ بھی کیا۔ حقیقی سوشلزم کے بارے میں اعتدال پسندی سے چند باتیں بھی کیں اور یہ بھی واضح طور پر کہہ گئے کہ ہم طبقاتی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور غیر طبقاتی معاشرہ کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ مہنگائی کا بھی ذکر کیا۔ اور پارٹی کارکنوں سے رابطہ کٹ جانے کا احساس بھی دلایا۔ مختصر تقریر تھی لیکن مندوبین کی تالیوں اور نعروں سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ ہر دلعزیز ضرور ہیں۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کسی حد تک اعتدال پسندی کا شکار ہو گئے۔ اگر شیخ صاحب کو علم ہوتا کہ ملک غلام مصطفےٰ کھر پنجاب کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے نہیں بلکہ بحیثیت گورنر پنجاب انہیں اس طرح للکاریں گے تو وہ یقیناً کھل کر بولتے۔ کیونکہ کھر صاحب نے اپنی تقریر میں سخت الفاظ میں چیئرمین صاحب سے گلہ کیا کہ آپ کی موجودگی اور آپ کی نرمی کی وجہ سے آج شیرِ پنجاب اور شیرِ سندھ وغیرہ پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ کھلی چھٹی آپ نے دے رکھی ہے۔ کہ ایسے کاغذی شیر پیدا ہوں۔ اگر میں پولیس کی ہڑتال چند گھنٹوں میں ناکام بنا سکتا ہوں تو اِن شیروں کا بھی مقابلہ کر سکتا ہوں۔

شیخ صاحب کے بعد میر رسول بخش تالپور کو بلایا گیا۔ (معلوم ایسے ہوتا ہے کہ ان دونوں بیباک رہنماؤں کو سب سے پہلے اور آگے پیچھے بلانے میں خاص مقصد تھا۔) تالپور صاحب نے مختصر لیکن نہایت مدلل تقریر کی۔ اُن کی اِن باتوں پر سامعین بے ساختہ تالیاں بجا رہے تھے۔ میر صاحب نے کہا کہ کارکنوں کو حق ہے کہ وہ ہمارا احساب لیں، اور یہ ہمارا حق ہے کہ ہم انہیں سنیں اور برداشت کریں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ سرکار اور تنظیم کو الگ الگ کیا جائے۔ اور اُنکے کارکنوں کو جو ہر کوڑے پر جیو بھٹو، صدر جیو کے نعرے لگاتے تھے ان کو نہ بھولیں۔ انہوں نے ہاریوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا بھی ذکر کیا۔

ان کے بعد حیات محمد خان شیرپاؤ جو ایسے موقعوں پر انتہائی مظلوم اور سادہ بن جاتے ہیں آئے اور اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا۔ اور یہ مانا کہ صوبہ سرحد میں نچلی سطح پر ہر جگہ تنظیم موجود ہے لیکن صوبائی تنظیم برائے نام ہے۔

ان کے بعد طاہر محمد ممبر سنٹرل کمیٹی۔ ملک باز محمد بلوچستان، پیر علی جان شاہ آزاد کشمیر، ملک غلام مصطفےٰ کھر، سیف الرحمان کیانی پشاور، جوہر علی صدر گلگت، مسٹر سلامت عطا انگلستان، وزیر محمد ملتان۔ فاروق علی صدر ملتان آئے ان میں سے بعض نے علاقائی مسائل بیان کئے۔ بعض نے تعریفوں کے پل باندھے اور شخصیت پرستی کا مظاہرہ کیا۔ اور کوئی بھی نظریاتی باتیں نہ کر سکا۔

ان کے بعد قاضی محمد شاہ صاحب نواب شاہ بولے اور خوب بولے۔ گو طبقاتی باتیں تو نہ کر سکے بہرحال جو کچھ کہا ڈٹ کر کہا۔ چیئرمین صاحب کو اس طرح مخاطب کرتے رہے جس طرح ایک بیباک اور صاف گو کارکن کو کرنا چاہیئے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہماری قیادت منشور سے ہٹ رہی ہے۔ سردار محمد اسلم، رکن سنٹرل کمیٹی ہزارہ آئے اور نہایت جرأت مندانہ طریقے سے کارکنوں کے ساتھ زیادتیاں، ہائی کمان کی کارکنوں سے رابطہ کی کمی۔ پارٹی کی گرتی ہوئی حالتِ زار اور وزراء صاحبان کی عیاشیاں اور نوکر شاہی کا گھیراؤ کے بارے میں بتایا۔ جن کی باتیں عام کارکنوں کے دِل کی دھڑکن تھیں۔ انکے بعد عبدالستار نیازی میانوالی شائستہ خان بلوچ۔ ڈی۔ آئی خان (یہ صاحب کچھ بہتر بولے) ڈاکٹر محمد صفدر سرگودھا سیف اللہ کوئٹہ نے تقریریں کیں۔

اور پھر میرے ذاتی خیال میں انقلابیوں میں سب سے کھل کر بولنے والے عبدالغنی شیخ جیکب آباد آئے۔ اور چیئرمین صاحب اور وزراء کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے چیئرمین صاحب کو صاف

صاف اور ایک بیباک اور نڈر کارکن کی طرح کہہ دیا کہ ہم پ۔پی پی۔ کو کنونشن لیگ نہیں بننے دیں گے اور آپ کو ایوب خان نہیں بننے دیں گے۔ انہوں نے چیئرمین صاحب کو صدر پاکستان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ساتھی کی حیثیت سے یاد دلایا کہ جب آپ میرے ضلع میں آئے تو مجھے آپ سے ملنے تک نہ دیا گیا۔ اور اس کنونشن کے لئے کارڈ بھی ڈپٹی کمشنر صاحب نے دوبارہ مانگے کیونکہ کسی وزیر کا حکم تھا۔ انہوں نے کہا کہ کیا بیوروکریسی ختم ہو چکی ہے یقین جانیں اب بھی آپ کے ارد گرد لوکر شاہی اور افسر شاہی ہے۔ اور آپ اصولوں سے منحرف ہو رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے تمام جی حضوریوں اور فاشسٹوں کو خبردار کیا کہ وہ وہی راستہ اپنائیں جن کے لئے اس ملک کے محنت کشوں نے آپ کو برسر اقتدار لایا ہے۔

اور آخر میں حفیظ پیرزادہ (جنہیں مندوبین نے سننے سے انکار کر دیا) آئے اور بڑی مشکل سے اپنی تعریفوں سے بھری تقریر ختم کی۔ ان کے بعد معراج خالد صاحب آئے۔ کچھ نشتر بھی چھوڑے لیکن نہایت محتاط طریقے سے۔ بہر حال کچھ کہہ بھی گئے اور کہتے کہتے رہ بھی گئے۔ انہوں نے چیئرمین صاحب سے کہا کہ ہم آپ پر جان دیتے ہیں لیکن اسمبلی کے اندر آپ کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ہم آپ کے لئے جان کی بازی کا نعرہ بھی لگاتے ہیں اور اسمبلی سے باہر آپ کے خلاف تحریک بھی چلاتے ہیں۔ آپ نے بنگلہ دیش کے حق میں تحریک چلائی تو پارٹی کارکنوں کا فرض تھا کہ وہ عوام کو سمجھاتے لیکن ہم تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اور آپ کی کوئی مدد نہیں کرتے نہ جانے یہ جی حضوریوں پر تنقید تھی یا انقلابیوں کیخلاف۔ اور ان کے بعد ممتاز علی بھٹو، حنیف رامے نے حق وفاداری ادا کیا اور آخر میں حضرت مولانا کوثر نیازی کو چھوڑا گیا جنہوں نے جی حضوریوں کی خامیاں پوری کر دیں۔ انہوں نے اس پیرائے میں تقریر کی کہ ادھر کارکنوں کو سراہا اور چیئرمین صاحب اور وزراء کی پالیسیوں پر پردہ ڈالا۔ بلکہ میرے خیال میں وہ چیئرمین صاحب کو لائن دے گئے کہ آپ کو کس طرح بولنا ہے مولانا صاحب کی تقریر کے دوران کارکنوں میں کھسر پھسر ہنسی مذاق اور خصوصاً فقرہ بازی بہت عجیب تھی۔ ایسے ایسے فقرے بھی سنے گئے جن پر یقین نہ آتا تھا۔ اور آخر میں چیئرمین صاحب بولے اور وہی مندوبین جو تاج بی بی، قاضی محمد شاہ، عبدالنبی شیخ، شیخ رشید اور رسول بخش تالپور کی تقریروں پر واہ واہ کے نعرے لگا رہے تھے، اب بڑھ چڑھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ اور دوسرے دن صرف قراردادیں پیش کی گئیں چیئرمین صاحب پر اعتماد کی تحریک جب منظور کرائی گئی تو آدھ گھنٹے تک بڑے بڑے سنجیدہ چہروں کو بھی ناچتے دیکھا گیا۔ شاید انقلاب ناچنے سے ہی آتے ہیں۔

آخر اس کنونشن کا مقصد کیا تھا جس میں پارٹی میں انتشار کی ان بنیادی وجوہات کو بھی زیر بحث نہ آنے دیا اور نہ ہی پارٹی کارکنوں کے اس مطالبہ کو کہ پارٹی کے عہدیدار یا پارٹی کے عہدے سنبھالیں یا وزارت نہیں مانا گیا۔ کاش کہ ادنیٰ طبقے کے ان کارکنوں کو بھی موقع دیا ہوتا جو پارٹی میں انتشار اور بحران کی اصل وجہ بتاتے جو اصولی اور نظریاتی ہے جو طبقاتی ہے، جو سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی وجہ سے ہے۔ اور جو قول و فعل میں تضاد کی وجہ سے ہے۔ یہ لتاڑ پھر کیسی جبکہ کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ہوتی، درب ہاؤس اور سہگل وغیرہ کب پارٹی میں شمولیت کر رہے ہیں۔ ۲۲ خاندان کب تک سوشلسٹ اور انقلابی ہو جائیں گے۔ یہ باتیں تو وہ غریب اور غربت کی چکی میں پسے ہوئے کارکن بتا سکتے ہیں جنہوں نے اپنا سب کچھ سوشلزم کی خوشی میں لٹا دیا۔ یہ باتیں تو پارٹی کے کسان کارکن بتا سکتے ہیں جو آج بھی دھرتی کا سینہ چیر کر ظالم جاگیرداروں کا پیٹ پال رہے ہیں، اور خود سسک سسک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ باتیں تو وہ پرولتاری کہہ سکتے ہیں جنہوں نے سوشلزم کے خواب دیکھے تھے۔ اور یہ باتیں تو کارخانوں، ملوں اور انڈسٹریز کے مزدور بتا سکتے ہیں جنہوں نے بہت بڑھ چڑھ کر انقلاب انقلاب کے نعرے لگائے تھے اور جنہیں پیوند کاری کی پالیسیاں ملی ہیں۔

ہم چھوٹے کارکن بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ کاش ہم سے پوچھتے اور ہم بتاتے کہ ہم نے اس لئے تو جدوجہد نہ کی تھی کہ اسی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے اسی نظام کو مسلط کر دیا جائے گا۔ بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو دوسرے دور میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور حقیقی انقلاب کو دس بارہ سال کے لئے اور پیچھے دھکیل دیا جائے گا۔ ہم بھوکے ننگے کارکنوں نے اس لئے تو جدوجہد نہ کی تھی کہ اسلامی سوشلزم اعتدال پسندی کا چولا اور موقع پرستی کی راہ اختیار کرے گی اور ہم بہت جلد معمولی معمولی تبدیلیوں کو انقلاب سمجھ بیٹھیں گے۔

کیا سوشلزم انقلاب اور محنت کشوں کے دشمن مودودی سے صلح مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے کا مقصد محنت کشوں سے دوستی کا اظہار ہے۔ کیا بائیس خاندانوں کو کچلنے کی بجائے بار بار حکومت سے تعاون کرنے کا مطلب غریب طبقہ سے محبت کا اظہار ہے؟ کیا سرحد میں ہونے والے کسانوں پر ظلم اور مزدور کسان پارٹی لیڈر پر کئے گئے سرحد حکومت کی طرف سے ظلم پر خاموشی اختیار کرنا کسانوں اور مزارعین سے محبت اور دوستی کا اظہار ہے۔

چیئرمین صاحب! کاش کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ آج تک اس ملک میں طبقے پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب ہم طبقاتی جدوجہد کا نام لیتے ہیں تو ہائی کمان کے بعض وزراء اسے منافرت کا نام دیتے ہیں۔ آج تمام دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتوں کو چھوڑ کر پارٹی کے چند انقلابیوں کے خلاف ہی کیوں محاذ بنایا جا رہا ہے۔ چیئرمین صاحب ہم کنونشن میں آپ سے آپ کے دائیں اور بائیں جانشینوں کے بارے میں بھی نہیں پوچھ سکے کہ دایاں جانشین تو موجود ہے بایاں جانشین کیوں کاٹ دیا گیا ہے۔

ہم کارکن تو قربانی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ جانی اور مالی قربانیوں کے علاوہ ہم ایسے ایسے بورژوا وزیروں کے جلسوں کے آگے ناچتے بھی رہے ہیں، جو آج ہم کارکنوں سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور پھر اس سے زیادہ ہم کارکنوں کا ذہنی استحصال اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب ہم طبقاتی جدوجہد کا نام لیتے ہیں تو اسے بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن پوری تاریخ جو طبقاتی جنگوں کی تاریخ ہے اس سے تو چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ آقا و غلام کی جنگ کی تاریخ مزارع، کسان اور جاگیردار کی جنگ کی تاریخ، مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کی تاریخ، سپاہی و افسر شاہی کی جنگ کی تاریخ، لوٹنے والے اور لٹنے والے کی جنگ کی تاریخ سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آج بھی ہم محض اعتدال پسندی ترمیم پسندی، اصلاح پسندی سے ہی کام لیتے رہے اور صحیح سوشلسٹ پالیسیاں نہ اپنائیں تو ہمیں بھارت کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ اور امریکی امداد پر انحصار کرنا پڑے گا۔

چیئرمین صاحب! ہم سے پوچھئے، پیپلز پارٹی کی مثال تو جنرل سٹور کی سی ہے، جس میں آپ کو ہر چیز ملے گی۔ سرمایہ دار و جاگیردار، پیشہ ور سیاست دان، اعتدال پسند، ترمیم پسند، اصلاح پسند، مزدور کسان، پرولتاری، انقلابی محنت کش پارٹی میں موجود ہیں۔ اور بھلا پھر مختلف نظریات اور مختلف سوچیں رکھنے والے ایک ہی قسم کا لائحہ عمل کس طریقے سے تیار کر سکتے ہیں ہم کارکنان تو بے بس اور مجبور ہیں۔ ہم نے تو محنت راج کے خواب دیکھے تھے۔ تاج اچھالنے اور تخت گرانے کی سوچی تھی۔ لیکن اب ہمیں جان کی امان پاؤں کہنے کے بعد بات کرنا پڑتی ہے۔

یہ باتیں ہم غریب کارکن نہیں پوچھ سکتے کیوں کہ باتیں پوچھ کر ہم معراج محمد خان، طارق عزیز، محمود نواز بابر وغیرہ وغیرہ جیسی مصیبتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم تو انھیں دور سے ہی عقیدت کا سلام کرتے ہیں۔

کنری

غازی مختار

منافع خور چینی سے چاندی بنا رہے ہیں

تقریباً تمام اخبارات نے چوکٹے میں یہ خبر شائع کی کہ ''گورنر سندھ نے چینی کی کمی اور بھاؤ کی زیادتی کے سبب چینی کی قیمت ڈھائی روپے فی سیر مقرر کر دی اسی خبر کے ساتھ ایک وزیر صاحب سے متعلق ایک بیان شائع ہوا کہ ''چینی گندم اور گھی کی قیمتیں کم ہو رہی ہیں'' اس قسم کے اعلانات اور بیانات نے عوام کو جھنجھلا کر رکھ دیا ہے۔ نہ تو قیمت بڑھانے سے مارکیٹ میں چینی کی قیمت کم ہو سکتی ہے اور نہ ہی وزیر صاحب کے بیان داغ دینے سے بھاؤ گریں گے۔ بلکہ جس دن گورنر سندھ نے چینی کے کنٹرول نرخ میں اضافہ کیا بازار میں چینی کی قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

گذشتہ سال چینی کے کارخانوں نے ملکی ضروریات سے کم چینی بنائی تھی مگر حکومت نے اور سرمایہ داروں نے بونس واؤچرز پر لاکھوں من چینی دوسرے ملکوں سے درآمد کی اور اس طرح اصل کھپت کے برابر چینی ملک میں آگئی۔ مگر پھر بھی چینی بازار میں نہیں مل رہی اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ چینی کی ذخیرہ اندوزی کر کے یہ مصنوعی قحط پیدا کیا گیا ہے۔ اور دوسرا سبب چینی کی غلط تقسیم ہے۔ ابھی حال ہی میں پارٹی کنونشن میں صدر محترم نے اعلان کیا کہ اگر کارخانوں نے چینی پوری مقدار میں مہیا نہ کی تو وہ اس صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیں گے۔ تو صاحب اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ حکومت پہلے کھاد کی صنعت بھی قومی ملکیت میں لے چکی ہے۔ چنانچہ اب غریب کسانوں کو بلیک کے بغیر کھاد حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے، اور تقریباً ۳۰ فیصد رقم زاید ادا کرنا پڑ رہی ہے۔

چینی کی گرانی کا دوسرا سبب غلط تقسیم ہے —— بحالت مجبوری ہم غلط تقسیم کا نام دے رہے ہیں ورنہ تقسیم وقسیم کچھ نہیں ایک دھاندلی ہے اور بس —— پیپلز پارٹی کے وزیروں سے لے کر عام چمچہ کارکنوں تک نے چینی کے ذریعہ چاندی بنالی ہے۔ اور بنا رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ راشن ڈپو منظور کئے جا رہے ہیں مگر صرف پیپلز پارٹی کے مفاد پرست اور عوام دشمنوں کو جو چینی گوداموں سے اٹھاتے ہیں اور بلیک میں دوکانداروں کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ خیر صاحب یہ تو راشن ڈپوؤں کی بات تھی اب راشن کارڈوں کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ شہر کے راشن کارڈ کنری پیپلز پارٹی کے آفس میں پارٹی والوں نے بنائے۔ یہ بات ذہن نشین رکھئے کہ ''حالیہ مردم شماری کے مطابق کنری کی آبادی ۹۰۹۵ ہے'' ''بھائیوں'' نے ۱۷۰۰۰ آدمیوں کے کارڈ بنائے ہیں۔ کنری کے دونوں راشن ڈپوں پر ۱۵۲۰۰ افراد کے کارڈ رجسٹر کئے گئے ہیں باقی ۱۸۰۰ آدمیوں کے کارڈ ڈپو ہولڈر رجسٹر نہیں کر رہے ہیں کیونکہ محکمہ نے گذشتہ مردم شماری کو سامنے رکھ کر ان ڈپوؤں کو جو چینی دی ہے وہ ماہوار ۱۳۲۰۰ آدمیوں کی ہے۔ یعنی محکمہ خوراک نے اصل آبادی سے بھی تقریباً ۴ ہزار زائد آدمیوں کے لئے چینی مہیا کی۔ اب فوڈ والے کیا کریں اگر شہر کے ''معتبرین'' نے کارڈ دوگنے بنا دیئے اور بیچارے ڈپو والے ان ۱۷۰۰۰ کو کہاں سے چینی سپلائی کریں جبکہ انہیں کل ۱۳۲۰۰ کے لئے چینی ملتی ہے۔

جعلی کارڈ بننے کا سبب یہ نہیں کہ کنری کے ''معتبرین'' کو صحیح تعداد کا علم نہیں یہ سب لوگ (کارڈ بنانے والے) شہر میں ایوب حکومت کے بی۔ ڈی ممبر رہ چکے ہیں اور اپنے اپنے وارڈ کے ہر ہر گھر کے افراد کی تعداد سے واقف ہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے خاص لوگوں کو زائد کارڈ جاری کئے ہیں۔ بلکہ ان کے بعض رشتہ دار اور دوست جن کا کنری سے تعلق ہی نہیں ہے انہیں بھی کارڈ بنا دیئے ہیں۔ اور کچھ کو کئی کئی جعلی راشن کارڈ دے رکھے ہیں۔ اور ان راشن کارڈوں کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان کے وارڈ میں جو غریب مسکین مخالفین تھے ان کے سرے سے کارڈ ہی نہیں بنائے گئے انہیں آج کل پر ٹرخا دیا گیا۔ کنری شہر میں ایسے ۲۰۰۰ آدمی موجود ہیں جن کے کارڈ نہیں بنائے گئے۔ اس طرح ایسے راشن کارڈ جو ڈپوؤں میں رجسٹر نہیں ہوئے ان کی تعداد ۳۸۰۰ ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ حکومت راشن پر ملنے والی چینی کی قیمت میں اضافہ نہ کرے۔ نہ ہی کارخانہ داروں کو کارخانے قومی ملکیت میں لینے کی دھمکی دی جائے کیونکہ حکومت کے نالائق کارندے اس قابل نہیں کہ اس صنعت کو چلا سکیں۔ بلکہ سرکاری مشینری اور پارٹی کی اصلاح کی جائے۔ چینی کے نرخ کو اعتدال پر لانے کے لئے حکومت کو چاہیے کہ چینی کا کنٹرول ختم کر دے کیونکہ پارٹی کے خاص ''صاحبان'' نے اس قدر دھاندلی کی ہے کہ کنٹرول ختم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اور یہ اصول ہے کہ جس چیز پر بھی کنٹرول لگایا جائے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اس کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جاتی ہے۔ کنٹرول ختم ہوتے ہی چینی کے بھاؤ کافی گر جائیں گے جس سے ہر آدمی چینی خریدنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس وقت ملک کی تقریباً ۸۰ فیصد آبادی کو راشن پر چینی نہیں مل رہی

گجرات

سویڈش انسٹیٹیوٹ پر جماعتیوں کی اجارہ داری

طارق جاوید چودھری

سویڈش پاکستان انسٹی ٹیوٹ گجرات ایک ایسا ٹیکنیکل ادارہ ہے جس پر اہل گجرات کو فخر ہے۔ پاک سویڈش سمجھوتے کے بعد پاکستان میں تین ادارے کھولے گئے۔ گجرات کے علاوہ انہوں نے کراچی اور ڈھاکہ میں بھی یہ ادارے قائم کئے۔ پہلے پہل یہ ادارے سویڈش ماہرین کی زیر نگرانی کام کرتے رہے۔ مگر تقریباً دو سال سے وہ مکمل طور پر صوبوں کے تحت چل رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سویڈش پاکستان انسٹی ٹیوٹ گجرات آج کل صوبہ پنجاب کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔

جب تک انسٹی ٹیوٹ سویڈش ماہرین کی زیر نگرانی رہا اس وقت تک طلباء اساتذہ اور دوسرا اسٹاف مطمئن رہا اور جہاں وہ اپنے فرائض تندہی سے انجام دیتے وہاں انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ مگر صوبائی حکومتوں کی تحویل میں آتے ہی انسٹی ٹیوٹ کے طلباء اور اساتذہ کی تمام خوشیاں اور رونقیں ہمیشہ کے لئے ان سے روٹھ گئیں۔ کیونکہ انسٹی ٹیوٹ پر ایک ایسے پرنسپل ایم اے احسان کی تقرری کی گئی جن کا فنی تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ موصوف صرف ایم۔ ایس۔ سی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں۔ اور نہ ہی ایسا کوئی تجربہ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک تجربہ اور ڈگری رکھتے ہیں۔ جس کی پاکستان میں اشد ضرورت واہمیت ہے۔ وہ ''خوشامد'' ہے۔

پرنسپل اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں اس انسٹی ٹیوٹ کا مہاراجہ ہوں۔ یہ کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ کیونکہ ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر بلا شبہ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کسی مہاراجہ کی جاگیر ہے۔ ایک وسیع و عریض محل جو گورنر ہاؤس سے کم نہیں اس میں رہائش پذیر ہیں۔

سویڈش گورنمنٹ نے دو واپل کاریں طالب علموں کے استعمال کے لئے دی تھیں تاکہ طلبار بوقت ضرورت انہیں استعمال کر سکیں۔ مگر کیا مجال طلبار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ بلکہ وہ تو پرنسپل کی ذاتی ملکیت بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک کار موصوف استعمال کرتے ہیں۔ اور دوسری ان کے بچے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ طالب علم شدید زخمی اور بیمار ہوئے اور انہیں فوری ہسپتال لے جانا پڑا طلبہ کی عاجزانہ استدعاؤں کے باوجود کار استعمال کرنے کی اجازت نہ دی گئی پچھلے ماہ ایک طالب علم کے گردہ میں شدید درد اٹھا لڑکے اُسے ہسپتال لے گئے اور داخل کرا دیا۔ مگر پرنسپل نے دوسرے روز اُسے ہسپتال سے خارج کرا دیا اور کہا کہ یہ خواہ مخواہ بہانے بنا کر وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔

پچھلے دنوں انسٹی ٹیوٹ میں ٹیچرز ٹریننگ کورس کے لئے داخلہ جاری تھا جس میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈپلوما ہولڈر داخلہ لے سکتے ہیں۔ آٹو ڈویژن کے آفتاب احمد کو جو سیکنڈ ڈویژن تھے۔ اور انسٹی ٹیوٹ کے بہترین کھلاڑی بھی۔ صرف اس لئے داخلہ نہ دیا گیا کہ وہ این ایس ایف کے سرگرم کارکن تھے۔ پرنسپل موصوف نے اسلامی جمعیت طلبار کے طالب علموں کو داخلہ دیا۔ بلکہ کمپارٹمنٹ والے لڑکوں کو بھی داخلہ مل گیا۔ اس صریحاً زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ پرنسپل جماعت اسلامی کے زبردست حامی اور ہمدرد ہیں۔ اور آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کو اپنا قریبی رشتہ دار بتاتے ہیں پچھلے ہفتہ جب اسلامی جمعیت کے رہنما اور پنجاب یونیورسٹی کے صدر جاوید ہاشمی گجرات آئے تو پرنسپل سلامی کے لئے حاضر ہوئے اور جماعت اسلامی والوں کو مکمل یقین دلایا

پرنسپل صاحب نے سٹوڈنٹس یونین کے لئے جو شرائط رکھی ہیں ان کے تحت تمام انسٹی ٹیوٹ سے صدر کے لئے صرف ۴ لڑکے الیکشن لڑ سکتے ہیں۔ اور وہ بھی ان کے خاص چہیتے ہیں۔ پچھلے دنوں حکومت پنجاب نے پرنسپل کو ایک سرکلر بھیجا کہ وہ بتائیں کہ انسٹی ٹیوٹ میں کتنے انسٹرکٹر صوبہ پنجاب سے باہر کے ہیں۔ پرنسپل نے جواب دیا کہ کوئی بھی نہیں جب کہ انسٹی ٹیوٹ میں ۱۶ انسٹرکٹر ایسے موجود ہیں جن کی مستقل رہائش پنجاب میں نہیں۔ اور پرنسپل خود بھی ان میں ہی شامل ہیں۔

ریاستی تشدد کا جواب - عوامی تشدد صفحہ ۶ سے آگے

کہلانے تھے۔ مزدوروں، اور محنت کش عوام میں مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے سہگل کے گڑھ میں اُسے شکست فاش دی۔ لیکن جب انہوں نے اصولی اختلاف کیا۔ تو جیل کی کال کوٹھری اُن کا مقدر بن گئی۔ دوسرے جانب عوام کا خون چوسنے والے سہگل کو نوازا گیا۔ اب وہ پی آئی اے اور ادارہ فروغ سیاحت کے سربراہ ہیں ملتان کے بابو فیروز الدین نے انتخابات میں ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے پیپلز پارٹی چھوڑ دی۔ سرمایہ داروں کے اخبارات اور جماعت اسلامی کے ترجمانوں نے پروپیگنڈہ کیا کہ اب پیپلز پارٹی ملتان میں کامیاب نہیں ہو سکے گی، لیکن ملتان کے مزدور رہنما محمود نواز بابر نے پیپلز پارٹی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچایا۔ شب روز محنت کی، مسٹر بھٹو نے ان کی محنت اور لگن سے متاثر ہو کر انہیں "شیر ملتان" کا خطاب دیا۔ اور محمود نواز بابر کی وجہ سے ہی بھٹو صاحب ملتان میں کامیاب ہوئے۔ لیکن مصطفیٰ کھر محمود نواز بابر کی مزدور دوستی سے خائف تھے۔ اس بات کا محمود نواز بابر کو بھی علم تھا۔ اندرون پارٹی مصطفیٰ کھر کے گٹھ جوڑ سے بھی بخوبی واقف تھے، پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد ایک ملاقات کے دوران انہوں نے صدر بھٹو سے مصطفیٰ کھر کی شکایت کی اور کہا کہ یہ شخص پارٹی کو تباہ کر رہا ہے، اس وقت مصطفیٰ کھر بھی موجود تھے، وہ اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہیں پیپلز پارٹی ضلع ملتان کی صدارت سے برطرف کر دیا اور چوری، ڈکیتی اور دیگر مختلف الزامات کے تحت گرفتار کروا دیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمود نواز بابر پر کوئی سیاسی الزام لگانے کی بجائے اخلاقی الزامات لگائے گئے۔ تاکہ انہیں چور، لٹیرا ثابت کیا جائے۔

پھر میاں چنوں کی پیپلز پارٹی کے چیرمین کی شامت آئی اُس نے گورنر پنجاب سے اصولوں کی بنیاد پر اختلاف کیا۔ تو اُس کے خلاف انتقامی کارروائیاں کی گئیں۔ اور آخر کار اُسے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ ڈیرہ غازی خان کے ڈاکٹر نذیر کو کسی نے قتل کر دیا۔ جماعت اسلامی نے شور مچایا کہ یہ سیاسی قتل ہے۔ گورنر پنجاب نے تحقیقات کا حکم دیا لیکن ابھی تک قاتل کو گرفتار نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی تحقیقات کا کچھ پتہ چلا۔

محمود علی قصوری جب تک حکومت میں رہے، حکومت اور مصطفیٰ کھر کے نزدیک بڑے پارسا، نیک اور شریف تھے۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دیا۔ اُن کے خلاف قتل کے الزام میں مقدمہ درج کر دیا گیا۔ اب بھی دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ خاموش رہو اگر بولے تو جان کی خیر نہیں۔ ایسا ہی سلوک احمد رضا قصوری سے کیا گیا۔

ان ہی اسباب کی بنیاد پر پیپلز پارٹی کے قومی کنونشن میں شیخ رشید اور معراج خالد نے دبے دبے الفاظ میں اشارتاً مصطفیٰ کھر پر نکتہ چینی کی اور بتایا کہ یہ پنجاب میں پارٹی کو تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن صدر بھٹو نے اپنی تقریر میں مصطفیٰ کھر کے مخالفین کو بُری طرح ڈانٹ پلائی۔ اس سے مصطفیٰ کھر کی ہمت افزائی ہوئی۔ کنونشن کے بعد مصطفیٰ کھر اور کھُل کر سامنے آ گئے۔ اتفاق سے حزب اختلاف نے ان ہی دنوں "بنگلہ دیش نامنظور" تحریک شروع کی، تو مصطفیٰ کھر نے بیانات داغنے شروع کئے "میں پولیس کی ہڑتال پر قابو پا سکتا ہوں، تو حزب اختلاف کیا شے ہے" "میں نے ابھی اپنی طاقت کا ۱۰واں حصہ بھی استعمال نہیں کیا ہے" اور ۱۴ دسمبر کو تو انہوں نے کھُل کر قتل عام کی دھمکی دی اولمپک ہاؤس میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "جمہوریت اور ڈائرکٹ ایکشن میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو، تشدد اور خونریزی مسلط کی گئی تو خون ارزانی سے بہے گا" یہ انداز گفتگو تو کبھی نواب آف کالا باغ نے بھی نہیں اپنایا تھا، ابھی مصطفیٰ کھر کی دھمکی کو دو دن ہی گذرے تھے کہ خواجہ رفیق قتل کر دیئے گئے۔

اب صدر بھٹو بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم تشدد کی سیاست اور جمہوریت دونوں کے لئے تیار ہیں، گورنر کھر نے گلیوں میں خون بہنے کی بات مخالفین کے جواب میں کہی تھی۔ میں ان کے بیانات کی تائید کرتا ہوں، ہمیں معذرت خواہانہ روّیہ کی کیا ضرورت ہے" یہ انداز گفتگو پیپلز پارٹی کے سربراہ کو زیب نہیں دیتا کیونکہ پیپلز پارٹی خود کو عوام کا نمائندہ اور جمہوریت کا حامی کہتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت نہیں جاگیردارانہ سیاست کا چلن ہے۔ اور جاگیردارانہ سیاست میں سیاسی قتل اکثر ہوتے رہتے ہیں خون ارزانی سے بہتا ہے۔ مخالفین پر اخلاقی نوعیت کے مقدمات دائر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ کوئی سر اٹھا کر نہ چلے، جاگیردارانہ سیاست کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ارباب اقتدار اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار نہیں کرتے، ہر بات کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سیاست اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں بھی سیاسی قتل ہوتے ہیں۔ کینیڈی کا قتل اس کی مثال ہے۔ لیکن اس قسم کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں۔ اور ارباب اقتدار معذرت بھی کر لیتے ہیں۔ اسے اپنے وقار کا مسئلہ نہیں بناتے۔

بقیہ: عالمی سیاست

دوران مارے گئے، ۴۵۷ ۳۰۳ زخمی ہوئے، ۵۴۵ قیدی بنالئے گئے اور ۱۱۵۴ لاپتہ ہیں۔ اس جنگ سے امریکی عوام کا کوئی مفاد اور فائدہ وابستہ نہیں چنانچہ انہوں نے زبردست مظاہرے کئے

عارضی جنگ بندی کا فوری سبب امریکی صدارتی انتخابات تھے۔ نکسن کے حریف میک گورن نے ویت نام کی جنگ کو اپنی انتخابی مہم کی بنیاد بنائی تھی۔ انہوں نے ویت نام میں فوری جنگ بندی اور امریکی فوجوں کے انخلا کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ نکسن نے انتخابات جیتنے کے لئے یہی حربہ استعمال کیا، ۸ رمئی ۱۹۷۲ء کو چار ماہ کے اندر اندر ویت نام سے تمام امریکی فوجیں واپس بلانے کا اعلان کیا، پھر آہستہ آہستہ فوجیں واپس بلوانی شروع کیں، ۱۷ جون ۱۹۷۲ء کو جنوبی ویت نام میں صرف ساٹھ ہزار امریکی فوج باقی رہ گئی پھر نکسن کے ہنری کیسنگر کے ذریعہ شمالی ویت نامی رہنماؤں سے خفیہ مذاکرات کئے۔ معاہدہ امن پر گفت وشنید ہوئی اور آخر کار ۲۸ اکتوبر کو عارضی طور پر جنگ بند کردی گئی۔

۳۱ راکتوبر ۱۹۷۲ء کو جنگ بندی کے سمجھوتے پر دستخط ہونے تھے، لیکن امریکہ نے پُر اسرار خاموشی اختیار کرلی۔ صدارتی انتخابات کے فوراً بعد نکسن نے اپنے چہرے سے امن پسندی کا نقاب نوچ ڈالا۔ دوبارہ صدر منتخب ہونے کے بعد ٹیلی ویژن پر امریکی عوام سے خطاب کرتے ہوئے صدر نکسن نے کہا "ویت نام میں عزت کے ساتھ امن قائم کیا جائے گا۔ جنگ بندی کے سمجھوتے کے بعض نکات پر اختلاف کا امکان ہے اس لئے ہم ان کی توضیح کا انتظار کر رہے ہیں۔ اختلافات کے نتیجے میں سمجھوتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے، ہم اسی وقت سمجھوتے پر دستخط کریں گے جب سمجھوتہ درست ہوگا اس سے ایک دن قبل بھی ہم دستخط کرنے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہم اس میں ایک دن کی تاخیر کریں گے، ہوا کا رخ بتا رہا تھا کہ صدر نکسن کیا چاہتے ہیں۔ کیونکہ لفظ "عزت" سے مراد یہ تھا کہ امریکہ اپنی شرائط پر سمجھوتہ کرے گا۔

اختلاف کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شمالی ویت نام نے جنوبی ویت نام سے اپنی فوجیں واپس بلوانے سے انکار کردیا ہے۔ جنوبی ویت نام کے صدر جنرل تھیو شمالی ویت نامی فوجوں کا مکمل انخلا چاہتے ہیں، جب کہ امریکہ کا مطالبہ ہے کہ ہنوئی جنوبی حصہ سے اپنی ۲۵ ہزار فوج واپس بلالے، امریکہ نے یہ موقف صدارتی انتخابات کے بعد اختیار کیا ہے۔ کیونکہ جب ہنری کیسنگر نے شمالی ویتنامی رہنماؤں سے اپنے خفیہ مذاکرات کا انکشاف کیا تھا۔ تو یہ نہیں بتایا تھا کہ شمالی ویت نام سے فوجوں کے انخلا پر کوئی گفت وشنید ہوئی ہے۔

اب صدر نکسن نے امن کے سمجھوتے پر دستخط نہ ہونے کی پوری ذمہ داری جنوبی اور شمالی ویت نام پر ڈال دی ہے۔ امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ جنرل تھیو اس سمجھوتے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ دلیل نہایت بودی ہے۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ جنرل تھیو امریکہ کے پٹھو ہیں، اور اسی کی وجہ سے برسر اقتدار ہیں۔ ورنہ ویتنامی عوام تھیو اور اس کی حکومت سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ ہفت روزہ "ٹائمز" کی حالیہ رپورٹ کے مطابق جنرل تھیو جنوبی ویت نامی عوام میں نہایت غیر مقبول ہیں، اور بغاوت کر رہے ہیں۔ جنرل تھیو کی حکومت ہر رات سائیگان میں تقریباً ۱۵۰ سے ۲۰۰ افراد کو ویت کانگ ہونے کے شک میں گرفتار کرتی ہے، جب اندرون ملک جنرل تھیو کی اتنی نازک پوزیشن ہو۔ تو وہ کس طرح امن کے سمجھوتے کی مخالفت کرسکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صدر نکسن کے اشارے پر ہی جنرل تھیو امن کے سمجھوتے کی مخالفت کر رہے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ امریکی سامراج ویت نام میں مستقل جنگ بندی اور امن نہیں چاہتے۔ کیونکہ جنگ کے خاتمے کے بعد انتخابات کا ہونا لازمی امر ہے۔ اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ عوام، شمالی اور جنوبی ویت نام کو متحد کرنے کے حق میں رائے دیں گے۔ جب کہ امریکی سامراج شمالی اور جنوبی ویت نام کے اتحاد کا مخالف ہے، کیونکہ دونوں حصوں کا اتحاد اس کے سامراجی مفادات کے منافی ہے۔ چنانچہ اب صدر نکسن "ویت نام کاری" (VIETNAMISATION) کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ اس پالیسی کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ ویتنام میں براہِ راست کی بجائے بالواسطہ جارحیت کرے۔ اس پالیسی کے تحت فیصلہ کیا گیا ہے کہ امریکہ جنوبی ویت نام سے اپنی فوجیں آہستہ آہستہ واپس بلالے گا۔ جنوبی ویت نامی پٹھو فوجیں، امریکی فوجیوں کی جگہ لیتی جائے گی۔ جنوبی ویت نام کی فوجوں کو امریکہ جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کردے گا۔ تاکہ وہ ویت کانگ کا مقابلہ کرسکیں غرض "ویت نام کاری" پالیسی کا مقصد ویت نامیوں سے ویتنامیوں کو لڑانا ہے۔

چین، سوویت یونین، بھارت، مصر، کیوبا، شام نے حالیہ امریکی جارحیت کی مذمت کی ہے لیکن حکومت پاکستان، شمالی ویتنام سے سفارتی تعلقات قائم ہوجانے کے باوجود تادم تحریر خاموش ہے اس کی پُر اسرار خاموشی عوام میں تشویش کا باعث بنی ہے۔

بقیہ ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

گے تاکہ وہ زرِمبادلہ حاصل کرسکیں اور اپنی معیشت کو خود کفیل بناسکیں۔ ترقی پذیر ملکوں کی ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ تجارت کی شرائط ہمیشہ ان کے قومی مفادات کے خلاف رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے اب تک مفلسی، غربت اور بدحالی کا شکار رہی ہیں۔ پھر جب ترقی یافتہ ممالک اپنی دوسری تمام اجارہ داریوں کے علاوہ بین الاقوامی شپنگ پر اجارہ داری کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنے لگیں کہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق تجارتی شرائط میں ردوبدل کیا جاسکے اور ترقی پذیر ممالک کی برآمدات پر کنٹرول رکھا جاسکے۔ تو ایسی صورت میں ترقی پذیر ممالک کے دن بدن بد سے بدتر اقتصادی بدحالی پر تعجب اور تاسف کرنا انتہائی احمقانہ اور مضحکہ خیز بات ہے۔

درآمدات کی گرانی

درآمدات کی قیمتوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوگا۔ اقتصادیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ مہنگائی کی جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کرے گا۔ اور بیرونی ممالک سے درآمد ہونیوالی تمام اشیاء کی قیمتوں میں پچیس سے تیس فیصد کا اضافہ ہوجائے گا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مال برداری کے کرایہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ کسٹم ڈیوٹی، سیلز ٹیکس اور دوسری حکومتی چنگیوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوگا، کیونکہ ان تمام ٹیکسوں کا حساب درآمدات کی اصل قیمتوں پر لگایا جاتا ہے جس میں مال برداری کا کرایہ بھی شامل ہوتا ہے۔

بقیہ: درباب سوشلزم وکمیونزم

کو انقلاب کے راستے سے کوئی شخص نہیں ہٹا سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ ایک انسان کو قید کرسکتے ہیں، لیکن نظریات کو قید نہیں کرسکتے۔ انقلابی نظریہ کا کوئی ملک اور قومیت نہیں۔ انقلابی نظریہ دنیا بھر کے محنت کش عوام کی ملکیت ہے۔ خواہ وہ لوگ یورپ میں رہتے ہوں یا امریکہ میں یا ایشیا اور افریقہ میں بستے ہوں۔

مارکس اور اینگلز کی تصنیف "کمیونسٹ پارٹی کے مینی فسٹو" کے آخری الفاظ کو عوام دشمن طاقتیں ایک بار پھر پڑھ لیں۔

انہوں نے لکھا ہے !۔

"کمیونسٹ اپنے نظریات اور مقاصد کو چھپانا پسند نہیں کرتے۔ وہ کھلے بندوں یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد کو بزورِ طاقت موجود سماجی حالات کا تختہ الٹ کر ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ حکمران طبقوں کو کمیونسٹ انقلاب کے تصور سے لرزنے دو۔ مزدوروں کے پاس اپنی بیڑیوں کے سوا کھونے کے لئے کچھ نہیں اور پانے کے لئے ایک دنیا پڑی ہے"۔